تیار کردہ: پروفیسر حمید خٹک گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج بنوں

ماڈل پیپر

پہلا سمسٹر بی ایس اردو مڈ ٹرم کل نمبر: ۳۰

سوال نمبر:۱۔ معروضی سوالات (۵)

سوال نمبر:۲۔ زبان کیا ہے، زبان کیوں کر پیدا ہوئی، زبان اور بولی میں فرق، بناوٹ کے لحاظ سے زبانوں کی تقسیم، تاریخی اور نسلی لحاظ سے زبانوں کی تقسیم

سوال نمبر:۳۔ اردو زبان کے مختلف نام اور وجہ تسمیہ: ہندی یا ہندوی ریختہ ہندوستانی اردوئے معلیٰ اور اردو
اردو کے علاقائی نام

سوال نمبر:۴۔ اردو زبان کی تشکیل کے مختلف نظریات کا تعارف:

۱۔ قدیم نظریے: میر امن دہلوی کا نظریہ محمد حسین آزاد کا نظریہ

۲۔ علاقائی نظریات: دکن میں اردو پنجاب میں اردو سندھ میں اردو
اردو کی بناوٹ میں افغانوں کا حصہ اردو کی تشکیل کی ابتدا بلوچستان سے ہوئی۔

۳۔ غیر علاقائی نظریات: اردو قدیم ویدک بولی سے بنی ہے۔
اردو مرہٹی کی سگی بہن ہے۔ اردو کی اساس دراوڑی ہے۔

سوال نمبر:۴۔ اردو اور پشتو کا تعلق

فائنل ٹرم کل نمبر: ۵۰

سوال نمبر:۱۔ معروضی سوالات (۱۰)

اردو زبان و ادب کا ارتقاء (نظم و نثر کے حوالے سے) آغاز تا ۱۸۰۰ء تک

سوال نمبر:۲۔ (۱) پہلا دور: مسلمانوں کی آمد ۶۴۴ء سے لے کر فتح دہلی ۱۱۹۳ء تک
(۲) دوسرا دور: ۱۱۹۳ء سے لے کر محمد تغلق کے سفر دکن ۱۳۲۷ء تک

سوال نمبر:۳۔ تیسرا دور (جنوبی ہند) میں اردو: ۱۳۵۱ء سے لے کر ۱۷۰۰ء تک (اس دور کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے)

(ا) گوجری (گجری) دور: ۱۳۵۱ء تا ۱۷۰۰ء تک (ب) بہمنی دور: ۱۳۵۱ء تا ۱۵۱۸ء تک

(ج) عادل شاہی دور: ۱۴۹۰ء تا ۱۶۸۶ء تک (د) قطب شاہی دور: ۱۵۱۸ء تا ۱۶۸۶ء تک

سوال نمبر:۴۔ شمالی ہند میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء ۱۳۲۷ء تا ۱۷۰۰ء تک

سوال نمبر:۵۔ ایہام گوئی کی تحریک اور اصلاح زبان

سوال نمبر:۶۔ اردو شاعری کا عہدِ زریں اور لکھنؤ کا دبستانِ شاعری

سوال نمبر:۷۔ اردو اور تحریکِ پاکستان (اردو ہندی تنازع کے پس منظر میں)

نوٹس

زبان کیا ہے۔؟

زبان وہ چیز ہے جس کے ذریعے انسان اپنے خیالات و احساسات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ صرف بولی کی صورت میں ہو گی یا تحریری صورت میں۔ زبان سے مراد ایک انسان کا دوسرے انسانوں تک اپنے تصورات اور خیالات کا پہنچانا صرف بولی یا تحریری صورت میں نہیں بل کہ اس میں انسانی اعضا بھی شامل ہیں۔یعنی آنکھیں، بھویں، ہاتھ، چہرے کے حرکات و سکنات بھی ایک طرح کی زبان کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور زبان کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوتِ گویائی شامل ہے اور جن کو ایک انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دہرا سکتا ہے۔"

امریکی ماہرینِ لسانیات بلاخ اور ٹریگر زبان کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"زبان اپنی مرضی سے قبول کیا ہوا آوازوں کا نظام ہے جو معاشرے کے افراد کو آپس میں مربوط کرتا ہے۔"

انگریز مصنف چارلس باربر کے بقول:

"زبان ایک اشاراتی نظام ہے اور اس کا مواد آوازیں ہیں۔"

زبان صرف آوازوں کا مجموعہ نہیں: بل کہ یہ کسی قوم کی تہذیب اور ثقافت کا آئینہ دار ہوتی ہے۔زبان دنیا کے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے اور ان میں ربط پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔دراصل زبان کسی قوم کی صدیوں کے تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ ہوتی ہے۔

زبان اور بولی میں فرق: وہ زبان جو کسی محدود علاقے میں بولی جائے اور جو ابھی تک تحریری حالت میں نہ ہو، جو تمام کیفیات و احساسات کا ساتھ نہ دے سکتی ہو، اس کو بولی کہتے ہیں۔اس کے علاوہ جانوروں کی زبان کو بھی بولی کہتے ہیں۔جب کہ زبان بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے جس میں ہر قسم کا مافی الضمیر بیان کیا جا سکے۔

زبان کیوں کر پیدا ہوئی: زبان کی پیدائش کے بارے میں عام طور پر دو تصورات پائے جاتے ہیں: اسلامی تصور، فلسفیانہ تصور

ا۔اسلامی تصور: قرآن سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو تمام اشیاء کے نام سکھائے تھے، یوں دیکھیں تو حضرت آدمؑ ابوالبشر ہونے کے ساتھ ساتھ ابواللسان بھی قرار پاتے ہیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ کی زبان کیا تھی۔اس میں اختلاف ہے۔ سیفی نے "کتابِ عروض" میں حضرت آدمؑ کی زبان سریانی بتائی ہے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز کے مطابق: وہ بہشت میں عربی زبان بوتے تھے وہاں سے نکالے گئے تو بطور سزا اللہ نے عربی زبان سلب کر کے سریانی بولی ان کی زبان پر چڑھادی۔ مصنف تاریخ خمیس نے معائم التنزیل سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو تمام زبانوں کے لغت سکھائے اور انہوں نے اپنی اولاد میں ہر ایک شخص سے ایک ایک زبان میں گفتگو کی۔

۲۔ فلسفیانہ تصور: انسان پیدا ہوتے ہی سانس لینا اور کھانا پینا شروع کرتا ہے لیکن بغیر کسی مدد کے وہ بولنا نہیں سیکھ پاتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ چلنا پھرنا انسان کی فطری یا وہبی صلاحیتیں ہیں، جب کہ زبان ایک کسبی صلاحیت ہے۔ چوں کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے وہ مختلف ضروریات کی بنا پر مجبور ہے کہ ایک دوسرے سے تعلق رکھے اور یہی تعلق زبان کے وجود کا باعث بنی۔

زبان کے وجود کے آنے کے بارے میں مختلف وجوہات:

۱۔ بو۔ وَو نظریہ: انسان نے جانوروں کی بولیوں کی نقل کرتے کرتے زبان سیکھی ہے۔

۲۔ پو۔ پو نظریہ: انسان خوف یا خوشی کے موقع پر جو مختلف قسم کی آوازیں منہ سے نکالتا ہے انہی آوازوں نے بعد میں منظم صورت اختیار کی اور زبان معرضِ وجود میں آگئی۔

۳۔ ڈنگ ڈانگ نظریہ: انسانی زبان کی آوازوں کا مفہوم کے ساتھ گہرا تعلق ہے، یعنی انسان پر بیرونی دنیا کے جو اثرات پڑتے ہیں اس سے انہوں نے ہر کیفیت کے مطابق مناسب مفہوم لیا ہے اور یہی مفاہیم بعد میں آواز کی شکل اختیار کر گئی ہیں۔

۴۔ یو۔ ھی۔ ھو نظریہ: جب انسان مل کر کام کرتا ہے تو کام کے وقت مختلف آوازیں منہ سے نکالتا ہے، یہی آوازیں بعد میں زبان کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔

۵۔ اشارات کا نظریہ: انسان پہلے اشاروں کے ذریعے ایک دوسرے تک اپنے خیالات پہنچاتا تھا۔ آج بھی گونگے اپنا مطلب اشاروں کے ذریعے دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ بعد میں انہی اشاروں سے تصویری زبان وجود میں آئی اور پھر آہستہ آہستہ بول چال کی زبان بن گئی۔

۶۔ موسیقی والا نظریہ: زبان کی آوازیں شروع شروع میں بہت طویل تھیں جو رفتہ رفتہ مختصر ہوتی گئیں اور آخر کار موجودہ صورت میں ڈھل گئیں۔

۷۔ میل جول کا نظریہ: انسان ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے اور یہی وابستگی وہ بنیاد ہے، جس کے نتیجے میں زبان معرضِ وجود میں آئی اور مختلف مراحل سے گزر کر موجودہ صورت اختیار کر گئی۔

بناوٹ کے لحاظ سے زبانوں کی تقسیم:

ماہرینِ لسانیات نے زبان کو بناوٹ کے لحاظ سے ان تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ تجریدی زبانیں (ISOLATING LANGUAGES): ان زبانوں میں ہر لفظ ایک مجرد یا اکائی ہوتا ہے، جو نہ تو کسی لفظ سے مشتق ہوتا ہے اور نہ ہی ان سے دوسرا لفظ بن سکتا ہے۔ ایسی زبانوں میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں اور معنی کا تعین بیشتر الفاظ کے سیاق وسباق اور لفظ کے ادا کرنے میں لہجے کے اتار چڑھاو پر منحصر ہوتا ہے۔ اس قسم کی زبانوں میں چینی سب سے اہم اور نمایاں ہے۔

۲۔ ترکیبی زبانیں (AGGLUTINATIIVE LANGUAGES): یہ ایسی زبانیں ہیں جن میں اشتقاق تو ہوتا ہے یعنی ایک لفظ سے دوسرا لفظ تو بن جاتا ہے، لیکن ایسے مرکبات یا مشتقات میں اجزائے مرکب میں کسی قسم کی اندرونی تبدیلی یا تغیر نہیں ہوتا۔ عام طور پر یہ اجزا سابقوں یا لاحقوں کی صورت میں استعمال ہوتے ہیں اور ہر جز اپنی مستقل شکل وصورت برقرار رکھتا ہے۔ س قسم کی مثال ترکی زبان ہے۔ مثلاً:
شیشہ (بہ معنی بوتل واحد)، شیشہ لر (بوتلیں جمع)، شیشہ لرم (میری بوتلیں)، شیشہ لرمز (ہماری بوتلیں)، شیشہ لرنزد (تمھاری بوتلیں)۔

۳۔ تحلیطی زبانیں(AMALGAMATIVE LANGUAGES): ان زبانوں میں اشتقاق کثرت سے ہوتا ہے کبھی دو لفظوں کو ملا کر ایک نیا مرکب لفظ بنایا جاتا ہے اور کبھی خود کسی لفظ میں اندرونی تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ اس قسم کی تبدیلی سے لفظ کی اندرونی ساخت بدل جاتی ہے اور وہ خاص معنی دینے لگتا ہے۔ برصغیر پاک وہند کی اکثر زبانیں اس گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

تاریخی اور نسلی اعتبار سے دنیا کی زبانوں کی تقسیم:

ماہرین لسانیات تاریخی اور نسلی اعتبار سے دنیا کی زبانوں کو آٹھ گروہوں یا خاندانوں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ سامی: اس میں عبرانی، فونیقی، عاشوری اور قدیم شام اور بابل کی وہ زبانیں شامل ہیں جو اب ناپید ہو چکی ہیں۔ موجودہ دور میں عربی، افریقہ کی چند حبشی زبانیں اس کی نمایندگی کرتی ہیں۔

۲۔ ہند چینی: اس میں چینی، سیامی(اس سلسلے کی سات زبانیں) تبتی(ہمالوی اور اسی سلسلے کی تیئس زبانیں) اور برمی معہ چھبیس شاخوں کے شامل ہیں۔

۳۔ دراوڑی: تامل، تلگو، ملیالم، کنڑی ہندوستان میں، براہوی پاکستان میں شامل ہیں۔

۴۔ مونڈا: اس میں ہندوستان کی گونڈ، سنتھال، منڈلی، راج محل اور سنبھل پوری شامل ہیں۔

۵۔ بانتو: افریقہ کی ایک سو پچاس زبانیں اس میں شامل ہیں۔

۶۔ امریکی ریڈ انڈین قبائل: متعدد ریڈ انڈین قبائل کی زبانیں ان میں بعض اب ان قبائل کے ساتھ ہی ناپید ہو چکی ہیں۔

۷۔ ملایا: اس علاقے کی متعدد زبانیں

۸۔ ہندیورپی: زبانوں کے اس عظیم سلسلے کو ہند آریائی اور ہند جرمانی بھی کہتے ہیں۔ یورپ اور ایشیا کی اکثر زبانیں اس گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً یورپ کی بیشتر زبانیں: انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور اطالوی وغیرہ، اسی طرح ایشیا کی بیشتر زبانیں: اردو، ہندی، فارسی، پشتو، سندھی اور پنجابی وغیرہ اس گروہ کو مزید کئی چھوٹے گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جیسے: ۱۔ جرمنک، ۲۔ ہند ایرانی، ۳۔ ارمنی، ۴۔ بلقان سلافی، ۵۔ البانوی، ۶۔ اطالوی، ۷۔ ٹیوٹونی، ۸۔ یونانی

اردو اور پشتو کا لسانی تعلق

اردو اور پشتو کا خاندانی تعلق: زبان کی واضح تعریف یوں ہے کہ زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے۔ اس کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ زبانوں کے خاندانوں میں سب سے اہم ہندیورپی خاندان ہے۔ اردو اور پشتو اسی شاخ کے ہند آریائی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ آریائی زبانوں میں اکثر زبانوں کی باہمی لسانی ہم آہنگی آج بھی ان کی بنیادی رشتے کی نشان دہی کرتی ہے۔ اردو اور پشتو دونوں نے عربی اور فارسی سے فیضان حاصل کیا ہے دونوں کی اہم لسانی اور ادبی روایتوں میں ایک خاص قسم کا اشتراک ملتا ہے۔ دونوں کا سماجی، سیاسی تاریخی اور تہذیبی پس منظر ایک ہے۔ صدیوں کی یگانگت کے علاوہ تقسیم ہند نے ان دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا ہے۔

اردو اور پشتو دونوں کے رسم الخط کا بیشتر حصّہ عربی اور فارسی حروفِ تہجی پر مشتمل ہے۔ ان کے بنیادی اور تعمیری الفاظ، حروفِ ربط اور صرفی و نحوی قاعدوں میں یک رنگی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ دونوں زبانیں بناوٹ کے لحاظ سے اشتقاقی اور نسل کے اعتبار سے آریائی ہیں۔

تاریخی وحدت: برصغیر پاک وہند کی تاریخ کا پہلا باب آریہ کی آمد سے شروع ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ مغربی علاقے یعنی افغانستان سے شمالی مغربی سرحدی علاقہ (خیبر پختون خوا) کے راستے سے ہو کر آتا ہے۔ کیوں کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف حملہ آور اس علاقے سے ہوتے ہوئے آئے۔ افغانی قدیم زمانے سے احمد شاہ ابدالی کے عہد تک مختلف سیاسی، تعلیمی اور تجارتی مقاصد کے حصول کے لیے ہندوستان آکر آباد ہوتے رہے اور یوں افغانوں اور ہندوستانیوں کے کئی مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور تجارتی نوعیت کے رشتے استوار ہوتے چلے گئے۔ جو زمانی اعتبار سے صدیوں پر محیط نظر آتے ہیں۔ افغانیوں کی آمد سے یہاں کی معاشرت پر بہت سے دوررس اثرات مرتب ہوئے، پھر مغلیہ دور حکومت میں انھوں نے اپنی بقا کی جنگ لڑی جس کے نتیجے میں یہاں مختلف پشتون ریاستیں وجود میں آئیں۔ افغانستان سے صرف فوج کے دستے ہی نہیں؛ بلکہ مسلسل تجارتی قافلے بھی وقتاً فوقتاً یہاں تجارت کی غرض سے آتے رہے نیز یہ کہ ہندوستان سے ایران کی تجارت بھی افغانستان کے راستے سے ہوتی رہی، چناں چہ افغانی تاجروں کو ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچنے کا موقع ملتا، جو مہینوں اور برسوں کے گشت اور قیام کے بعد واپس افغانستان پہنچتے اور بعض اوقات یہ تاجر یہاں مستقل طور پر رہائش اختیار کر جاتے۔

پشتون تاجروں کے علاوہ افغانی درویش اور علمائے دین نے بھی ہندوستان میں اپنے مبارک قدم رکھے، جنھوں نے مختلف علاقوں میں اپنی خانقاہیں بنوائیں اور یہاں مستقل طور پر رہ پڑے۔ اِن درویشوں کے طفیل یہاں کے مذہب اور یہاں کی زبان پر ان مٹ نقوش مرتب ہوئے۔ مختصر یہ کہ سپاہیوں، تاجروں، درویشوں، عالموں اور طلبہ کی ایک معقول تعداد ہر عہد اور ہر زمانے میں افغانستان سے آکر یہاں آباد ہوتی رہی۔

اشتراکِ ماخذ: اردو اور پشتو آریائی زبانیں ہیں اور ان دونوں زبانوں کو ایک مورثِ اعلیٰ کی اولاد تسلیم کر لیا گیا ہے تو پھر یہ بحث محتاجِ دلیل نہیں کہ ان کا خاندانی اور نسلی تعلق کیا ہے۔ ان دونوں میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو آریائی گروہ کی زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان کے مولد و ارتقا کے علاقے اور ادوار مختلف ہیں لیکن ان کے چہروں کی مشابہت پہچانی جا سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان دونوں زبانوں کا رشتہ ماں بیٹی کا نہیں ہے لیکن پھر بھی خالہ زاد بہنیں کہلائی جا سکتی ہیں۔ جن کا خاندان اور ماحول ایک سا اور جن کے پرورش کے طور طریقے بھی یکساں ہیں۔

ہم وطن زبانیں: اگرچہ پشتو افغانستان کے کچھ علاقوں کی زبان ہے لیکن یہ زیادہ تر صوبہ خیبر پختون خوا اور بلوچستان کے علاوہ کراچی میں بولی جاتی ہے اس کے علاوہ سیکڑوں پشتون تلاشِ معاش کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں مثلاً: روہیل کھنڈ، رام پور، جاورہ، دکن، مالوہ، خاندیس وغیرہ میں اپنی زبان لے کر پہنچے نیز آج پاکستان کا کوئی علاقہ ان سے خالی نہیں، کراچی سے خیبر تک پشتون آباد ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کو اپنایا، اس لیے ان دونوں زبانوں میں وطنی اور ملکی وحدت ملتی ہے۔ جو ان کے ارتباط کو بڑھاتی ہے۔ اگر دو زبانیں ایک ہی علاقے میں اور ایک ہی ملک میں بولی جاتی ہو تو ان میں لین دین کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

تہذیبی تعلق: ہندوستان کی انسانی تاریخ تقریباً چھے ہزار سال پرانی ہے۔ اس طویل عرصے میں مختلف قسم کے تہذیبی عناصر کے باوجود یہاں کی تہذیب میں مخصوص قسم کے تہذیبی وحدت نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر چیٹرجی کا یہ خیال صحیح ہے کہ ہندوستان میں آنے والے دراوڑ، آریہ، منگول یہ سب

مختلف اختلافات کے باوجود ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں۔یونان، کشان، ساکا، ھن اور دیگر اقوام کے افراد نے ہندوستان کی تہذیب پر غیر معمولی اثرات چھوڑے۔ان کے اس رائے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اردو اور پشتو اُن تمام تہذیب کا ماحصل ہیں۔

لسانی وحدت: یہ دونوں زبانیں آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ دونوں زبانوں میں تاریخی اور جغرافیائی وحدت پائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ دونوں زبانوں نے ایک جیسے ماحول میں پرورش پائی ہے اس لیے ان دونوں زبانوں میں بہت زیادہ لسانی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔اردو اور پشتو دونوں زبانوں کے ذخیرہ الفاظ میں عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی زبانوں کے الفاظ کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اسلام کے بعد ہندوستان میں سب سے پہلے آنے والے یقیناً افغان ہی تھے جو بادشاہوں، عالموں اور صوفیوں کی حیثیت سے یہاں آئے۔پشتو زبان ہندوستان میں پہنچنے کے بعد بادشاہوں کی زبان ہوتے ہوئے بھی ہند کی ادبی، دفتری یا تعلیمی زبان نہ بن سکی اور بول چال تک محدود رہی مگر اس نے اردو زبان کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا۔پشتو اردو کے ساخت پر تو اثر انداز نہ ہو سکی مگر تذکیر و تانیث، محاورات، ضرب الامثال اور الفاظ کے معاملے میں اس نے نمایاں حصہ لیا اس طرح وہ فارسی، عربی اور ترکی زبان سے کسی طرح بھی کم نہیں رہی۔ آیئے چند الفاظ دیکھتے ہیں جو پشتو سے اردو میں آئے ہیں:

برخہ، بچو نگڑہ، بربنڈ، پلنگ، تار پہ تار، تخت پوش تڑاق، جاگیر، جواری، چٹ پٹ، چرس خلتہ، خیل، خلاملا، دم دلاسہ ڈنگر وغیرہ۔

اردو میں کچھ کہاوتیں بھی ایسی ہیں جن کے متعلق امتیاز علی عرشی کا خیال ہے کہ وہ پشتو کی راہ سے اردو تک پہنچی ہیں۔مثلاً "گھوڑے کی لات گھوڑا ہی سہتا ہے۔" افغانی اس موقع پر بولتے ہیں۔

۱۔ دَ اَس لَته اَس سَهلَے شي ۔یہ پشتو کہاوت بعینہ اردو الفاظ کا ترجمہ ہے۔

اِسی طرح پشتو میں کہا جاتا ہے:

۲۔ اسونو نعلونَه وَهَل، چِیندوخو هم وَرتَه پښې ونیولې ۔

اردو میں کہتے ہیں "گھوڑے کے نعل لگ رہے تھے، مینڈکی نے بھی ٹانگ اٹھا دی۔" یہ لفظ پشتو کا ٹھیٹ ترجمہ ہیں۔مولانا امتیاز علی عرشی نے ۵۶ کہاوتوں کی نشاندہی کی ہے جو پشتو سے اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں۔

پشتون نثر نگار اور شعرا: سب سے پہلے ہم ان نثر نگاروں اور شعرا کا تذکرہ کرتے ہیں جو پشتون تھے۔پشتو میں نثر لکھتے اور شاعری کرتے تھے، لیکن انھوں نے نہ صرف اردو اثرات کو اپنی تحریروں میں نمایاں جگہ دی، بلکہ اپنی شاعری کو بھی ان سے سنوارا اور اردو کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دیں اس دور کے پشتون شعرا اور نثر نگاروں کی تحریروں میں اردو افکار اور اثرات کا نظر آنا اردو کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کی ایک واضح دلیل ہے کہ خیبر پختون خوا جیسے دور افتادہ علاقہ میں بھی پشتون علماء صوفیاء اور شعراء نے اردو میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ظاہر ہے کہ اس دور میں اردو سمجھنے والے نہ صرف اس علاقے میں بلکہ مرکزی ہند میں بھی کم ہونگے پھر آخر ان پشتون شعرا نے اردو سے گہری دل چسپی کا اظہار کس لیے کیا۔جواب یہی ہے کہ دونوں زبانوں کا قدیم تہذیبی تعلق رہا ہے۔اردو پر صوفیا کا بڑا احسان ہے جنھوں نے اس کے ترویج میں حصہ لیا ہے۔اس سلسلے میں پشتو کے ایک بزرگ صوفی بایزید انصاری کا نام قابلِ ذکر ہے۔

بایزید انصاری پیر روشان کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں جو ایک تحریک روشانیاں کے بانی تھے۔انھوں نے "خیر البیان" کتاب لکھی جس میں بیک وقت چار زبانوں میں دین کے مسائل کے مطالب کو بیان کیا گیا ہے۔عربی، فارسی اور اس کے بعد پشتو اور اردو میں یہ سلسلہ ابتدائی چند صفحات میں قائم کیا گیا ہے۔اردو کی ادبی تاریخ کا آغاز ملا وجہی کی "سب رس" ۱۰۲۵ھ / ۱۶۳۵ء سے ہوتی ہے۔ لیکن اس ادبی و علمی کاوش سے نصف صدی بیشتر

خیبر پختون خوا میں بیٹھ کر پیر روشان اپنے خیالات اردو میں پیش کر چکے تھے۔"خیر البیان" کی اردو نثر لسانی اعتبار سے بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے اس کی مثال دیکھیے۔

"اے بایزید لکھ وہ اکھر جسے سب جیب سہن جڑ تھیں اس کارن جسے نفع پاویں آدمیاں کچ کا۔ میں ناہیں جانتا ہین قرآن کے اکھر ہے۔ سبحان اے بایزید لکھنا اکھر کا تجھے ہے دکھلاونا اور سکھلاونا مجھے"

اس کتاب کا پشتو اقتباس بھی دیکھیے۔

پشتو: وکینه په آغاز د کتاب په ښه درست حرفونو بسم الله تمام ۔

اردو: (لکھ کتاب کے آغاز کے بیان جن کے سارے اکھر سہن بسم اللہ)

اس مختصر سے فقرے میں بھی آغاز، بیان، درست، بسم اللہ اور تمام جیسے حروف اردو اور پشتو کے مشترک تعلق کا پتا دیتے ہیں۔

دولت لوہانی پہلا پشتون شاعر ہے جس کے دیوان میں ایک ذولسانی شعر ملتا ہے جس میں اردو اور پشتو کو بڑے خوب صورت انداز میں یکجا کیا گیا ہے دولت کا زمانہ ۱۰۰۰ھ کے قریب ہے۔

هغه کس جاهل ابتر هے
څوک عاشق په سيم وز هے

پشتو کے مشہور شاعر خوشحال خان خٹک (۱۶۱۳ء تا ۱۶۸۹ء) کو پشتو شاعری اور ادب کا "باوا آدم" کہتے ہیں ان کی پشتو نما اردو غزل دیکھیے۔

په سينه کښې مې اودهٔ مينه پهر جاگى
څما ستا محبت كوره كيسے لاگى
د رقيب وينا يې ياده شوه كه څه شوه
سپينه خوله ئې په خندا راؤړه پهربهاگى
زهٔ خوشحال چې لا له ورايه ورښکاه شوم
په خندا ئے وے چې آؤ ميرا بيراگى

عبد القادر خان خٹک خوشحال خان خٹک کا بیٹا اور صاحب دیوان شاعر ہے اس کا ایک شعر ہے۔

ماتې ماتې زلفې بيا په مخه راغله
روغه خلقه پهر همارا توبه ٹوٹا

معز اللہ مہمند ۱۱۶۷ھ کا شعر ہے۔

معزالله لا سيدها لاس ورورے نهٔ وو
بيا ئې غبر کړ ميرا هار گلے کا ٹوٹا

پشتو اور اردو کے ان ملے جلے اشعار سے دونوں زبانوں کے قریبی رابطے کا پتہ چلتا ہے۔ جب اس دور کے تحریری ادب میں اردو الفاظ کی آمیزش کا یہ حال ہے تو بول چال کی زبان میں اردو کے اثرات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اردو کے پشتون شعرا کی تعداد ہزاروں میں ہے ان میں قاسم علی خان آفریدی پیدائش (۱۷۵۲ء) کا مرتبہ بہت بلند ہے، جس کے دیوان میں دو سو اردو غزلیں ملتی ہیں۔ معز اللہ مہمند اردو کے بھی اچھے شاعر تھے۔ ان کے دیوان میں پشتو کے ساتھ اردو کی بھی غزلیں ملتی ہیں۔ اردو میں "افغانؔ" تخلص کرتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی تقسیم سے قبل بہت سے ایسے پشتون شعرا گزرے ہیں جنھوں نے پشتو اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی۔

چناں چہ اردو زبان کے مزاج کے بارے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کا یہ قول بجا ہے کہ:

"اردو اپنی فطرت سے بڑی ملنسار اِھلی گہلی اور ہر زبان سے گھل مل کے شیر وشکر ہو جانے والی زبان ہے۔ قدیم پراکرت اور سنسکرت سے اس کا ناتا ہے ہی، فارسی عربی، پشتو، پرتگالی، کول، انگریزی زبانوں سے بھی اس کا خلا ملا رہا ہے۔ ان سب نے کچھ دیا ہے اور چراغ سے چراغ جلایا ہے۔

اردو زبان و ادب کا ارتقاء (نظم و نثر کے حوالے سے)

اردو زبان و ادب آج جس مقام پر ہے اس کے لیے اس نے صدیوں کا سفر طے کیا ہے۔ شروع شروع میں اردو زبان و ادب کی کیا حالت تھی؛ اس زبان کے لسانی ڈھانچے (صرف، نحو، افعال و تراکیب) پر کون کون سے زبانوں کے اثرات تھے، اس کے ادب نے کس کس زبان سے خوشہ چینی کی ہے، یہ دیکھنے کے لیے ہمیں صدیوں پیچھے جانا پڑے گا۔

اردو کی پیدائش کے بارے میں اکثر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ زبان مسلمانوں اور یہاں کی مقامی باشندوں کے اختلاط سے وجود میں آئی۔ یہ اختلاط کہاں کہاں ہوا اور اس سے پہلے یہاں کی مقامی زبان کیا تھی جس سے مسلمانوں کی زبانوں یعنی عربی، فارسی، ترکی اور پشتو کا اختلاط ہوا، آیئے اس کے لیے تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالیں:

اردو کا تعلق ہند آریائی خاندان سے ہے۔ ماہرینِ لسانیات نے ہندوستان کی ہند آریائی گروہ کے چار ادوار قائم کیے ہیں۔ پہلا دور جسے سنسکرت کا دور کہتے ہیں یہ ۱۵۰۰ (ق۔م) سے لے کر ۶۰۰ (ق۔م) تک ہے۔ اس سنسکرتی دور کا نمونہ رِگ وید ۱۲۰۰ (ق۔م) میں ملتا ہے اس دور کا اختتام بدھ مت اور جین مت کے ظہور پر ہوتا ہے۔ دوسرے دور کو پراکرتی دور کہتے ہیں۔ یہ دور ۶۰۰ (ق۔م) سے ۷۰۰ء تک ہے۔ تیسرا دور ۷۰۰ء سے کر ۱۰۰۰ء تک ہے۔ اس دور کو اب بھرنش کا دور کہتے ہیں۔ اس دور میں مختلف اب بھرنش زبانیں وجود میں آئیں مثلاً: پساچی اب بھرنش، شورسینی اب بھرنش، مہاراشٹری اب بھرنش اور ماگدھی اب بھرنش، جب کہ چوتھا دور مسلمانوں کی آمد کے بعد شروع ہوتا ہے۔ بعض علما اس دور کو بھاشا کا دور کہتے ہیں۔ انھی اب بھرنش اور بھاشا زبانوں اور مسلمانوں کی زبانوں کے اختلاط سے اردو کا ابتدائی خمیر تیار ہوا۔

ہندوستان میں مسلمان تین مختلف حیثیتوں سے (بطورِ تاجر، بطورِ حکمران، بطورِ صوفی) وارد ہوئے اور تینوں حیثیتوں سے یہاں کے عقائد، تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے اس لیے اردو کی اس ارتقائی سفر کو ہم مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہیں، لیکن اس سے پہلے اردو زبان کی صوتیات (حروفِ تہجی) پر ایک نظر ڈالتے ہیں، تاکہ آئندہ بحث میں آسانی رہے۔

اردو میں حروفِ صحیح (مصمتوں) کی تعداد (بہ استثنائے ہائیہ) ۳۷ ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ خالص ہندی: ٹ، ڈ، ڑ۔ (۳) یہ وہ آوازیں ہیں جو مقامی زبانوں میں شامل تھیں۔

۲۔ خالص فارسی: ژ۔ (۱)

۳۔ خالص عربی: ذ، ض، ط، ظ، ث، ص، ع، ح، ء۔ (۹)

۴ مشترک آوازیں: آ، ا، ب، پ، ت، ج، چ، خ، ر، ز، س، ش، ف، غ، ک، ق، گ، ل، م، ن، و، ہ، ی، ے (۲۴)

ان میں سے خ، ف، غ، عربی اور فارسی میں مشترک ہیں۔ پ، چ، گ، ہندی اور فارسی میں اور ق اردو اور ترکی میں مشترک ہیں۔

حروف کے علاوہ املا اور رسم الخط میں بھی زبان کے ساتھ ساتھ ارتقاء ہوا ہے مثلاً: ٹ، ڈ، ڑ، کے املا کے لیے شروع میں کبھی تین نقطے، پھر چار نقطوں کا استعمال ہوتا تھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں پہلے چار نقطوں کے بجائے دو نقطوں اور ان کے اوپر کبھی چھوٹی سی لکیر یا چھوٹی سی ط کا نشان، پھر نقطے ختم کر دیے گئے اور صرف ط کا نشان رہنے دیا گیا۔ اس کے علاوہ ک اور گ، ے اور ی میں بھی نقطے دے کر فرق کیا جاتا تھا۔

پہلا دور: مسلمانوں کی آمد ۶۴۴ء سے لے کر فتح دہلی ۱۱۹۳ء تک

مسلمان برصغیر پاک و ہند میں ۶۴۴ء کو آچکے تھے، جب مسلمانوں نے مکران فتح کیا مگر محمد بن قاسم ۷۱۲ء / ۹۴ھ سے مسلمان برصغیر کے اچھے خاصے حصے پر قابض ہو گئے اور مسلمانوں کے زیر تسلط سندھ، ملتان اور پنجاب کے اکثر حصّے آ گئے۔

امیر سبکتگین پہلا مسلمان بادشاہ تھا جو برصغیر میں شمال مغرب کے راستے داخل ہوا اور جس نے پشاور ۹۹۷ء کو فتح کر کے یہاں پہلا مسلمان حاکم مقرر کیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمود غزنوی سلطنتِ غزنیہ پر قابض ہو گیا۔ اس نے اپنے ۳۲ سالہ حکومت میں افغانستان، خراسان، ایران اور ترکستان کے علاوہ کرمان، پنجاب اور خیبر پختون خوا کے اکثر علاقے فتح کیے۔ محمود نے ۱۰۲۲ء کو پنجاب کا الحاق سلطنتِ غزنی سے کیا۔ آلِ غزنوی کی حکومت تقریباً سوا سو سال رہی۔ ۱۱۸۶ء کو شہاب الدین غوری نے آخری غزنوی سلطان خسرو کو قتل کر کے لاہور پر قبضہ کیا۔ اردو کا ابتدائی سانچہ اسی دور میں تیار ہوا۔

اسی زبان سے مسلمان تاجر پنجاب کے مختلف علاقوں میں بطورِ کاروبارِ زندگی کے کام چلاتے رہے۔ اسی طرح صوفیائے کرام بھی اس زبان میں رشد و ہدایت دیتے رہے۔ اس دور میں ایک بزرگ شیخ اسماعیلؒ ۱۰۰۵ء کو لاہور آئے لیکن لاہور کے تعلق سے مشہور ترین نام حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ (۱۰۷۲ء) کا نام ہے جو داتا بخشؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک اور بزرگ سلطان سخی سرورؒ (۱۱۸۱ء) جو لکھ داتا کے نام سے معروف ہوئے، بھی تشریف لائے۔ اگرچہ اس دور میں زبان کی پختگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو کسی علمی یا ادبی تخلیق کا ساتھ دے تاہم اس دور میں بھی محمد عوفی کے تذکرہ "لباب الالباب" اور امیر خسرو کے دیوان "غرۃ الکمال" کے دیباچے سے ایک شاعر مسعود سعد سلمان کا پتا چلتا ہے جس نے یہاں کی زبان میں شاعری کی۔ دراصل یہ پہلے شاعر تھے جنھوں نے نہ صرف فارسی شاعری میں ہندی روایاتِ ادب اور مقامی رنگ کو جگہ دی بلکہ باقاعدہ دیوان مرتب کر کے پہلے ہندوی شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

ہمیں اس دور کی زبان کا کوئی باقاعدہ نمونہ تو میسر نہیں البتہ اس ودر کے وہ الفاظ جو آج بھی ہمیں اردو میں نظر آتے ہیں، وہ کوتوال اور پانی جیسے الفاظ ہیں جو حکیم سنائیؒ کے ہاں ملتے ہیں۔

دوسرا دور: ۱۱۹۳ء سے ۱۳۲۷ء تک

یہ دور شہاب الدین غوری کی فتح دہلی ۱۱۹۳ء سے لے کر محمد تغلق ۱۳۲۷ء کے سفر دکن تک ہے۔ مسلمان حکمران پہلی بار دہلی آتے ہیں تو اپنے ساتھ وہ زبان جو پنجاب میں سوا سو سال میں بنی تھی، ساتھ لاتے ہیں اور اسی زبان میں مقامی لوگوں سے کلام کرتے ہیں۔ اگرچہ دربار کی زبان فارسی تھی لیکن بادشاہ بھی مقامی لوگوں سے خطاب کے لیے مقامی زبان استعمال کرتے تھے۔ یہی حال صوفیائے کرام اور علمائے دین کا بھی تھا۔ اسی دور میں جو صوفیائے کرام ہندوستان آئے ان میں خواجہ معین الدین چشتیؒ (م۔ ۱۲۳۵ء) جیسے ولی اللہ بھی شامل ہیں جو عوام میں "غریب نواز" کے لقب

سے مشہور ہوئے۔ آپ نے ملتان میں ہندی زبان سیکھی اس کے بعد اجمیر شریف چلے گئے۔ جہاں پر اسی عوامی زبان میں دین کی اشاعت میں مصروف ہو گئے۔

اس دور کی زبان کے چند نمونے مختلف صوفیا اور شعراء کے کلام میں ملاحظہ ہوں:

۱۔ شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ (۱۱۷۳ء۔۱۲۶۵ء): آپ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ملتان کے شہر اجودھن (پاک پتن) میں رہتے تھے۔ آپ کے اقوال؛ ملفوظات، فقرے اور دوہوں میں محفوظ ہیں۔ آپ کے چند فقرے جو ہم تک پہنچے ہیں:

"مادر موموناں، پوتیوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے۔"

"جس کا سائیں جاگتا سو کیوں سوئے داس۔"

دوہے کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

اٹھ فریدا! ستیا تے جھاڑو دے مسیت — توں ستیا تے رب جاگدا تیری ڈاھڈے نال پریت

۲۔ شیخ حمید الدین ناگوری (۱۱۹۲ء۔۱۲۷۴ء): آپ کے والد نے آپ سے یہ فقرہ کہا تھا:

"ہاں! بابا کچھ کچھ"

۳۔ شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتیؒ (م ۱۲۲۳ء): آپ سے ایک دوہا یادگار ہیں:

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے — بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نہ جائے

۴۔ ابو الحسن یمین الدین امیر خسرو (۱۲۵۳ء۔۱۳۲۵ء): آپ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے۔ آپ نے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا اور ۹۹ کتابیں تصنیف کیں جن میں: ہندی میں خالق باری، کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، انملیاں اور گیت وغیرہ شامل ہیں۔ آپ نے ہندی شاعری کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک مصرع فارسی میں اور دوسرا مصرع ہندی میں لکھا۔ کبھی آدھا مصرع فارسی میں اور آدھا ہندی میں لکھا۔ امیر خسرو کی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر امیر خسرو کا یہ شعر درج ہے:

گوری سوئے سیج پہ مکھ پہ ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانج بھئی چو ندیس

۵۔ امیر حسن، حسن دہلوی (م۔۱۳۳۷ء): امیر خسرو کے بعد اس دور کے بڑے شاعر حسن دہلوی ہیں جس نے اردو زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ عبدالرحمٰن جامی نے اسے سعدیِ ہندوستان کہا ہے۔ اس کی ایک غزل ہم تک پہنچی ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

ہر لحظہ آید در دلم دیکھوں اوسے ٹک جائے کر

گویم حکایت ہجر خود با آں صنم جیئو لائے کر

اس دور میں اردو کے یہ الفاظ ہمیں ملتے ہیں: منہاج سراج اور طبقات ناصری (۱۲۵۹ء) میں سیل، لک، بہار بہ معنی وہار، سمندر، پایک (پیادہ)امیر خسرو کے قرآن السعدین میں، چوترہ، کوزہ، بالا، بیل، سال اور ضیا الدین برنی کے تاریخ فیروز شاہی میں رائیگاں، مک، ڈھولک، گھاٹی اور کوتوال وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں۔

تیسرا دور: (۱۳۲۷ء سے ۱۷۰۰ء تک)

اردو زبان کے آغاز وارتقاء کا تیسرا دور محمد تغلق کے اس حکم سے شروع ہوتا ہے جب انھوں نے ۱۳۲۷ء کو دہلی کی بجائے دولت آباد (دیو نگری) کو دارالسلطنت بنانے کا حکم صادر فرمایا اور دہلی کی ساری آبادی کو دولت آباد جانے کا حکم دیا۔ دفاعی نقطۂ نظر سے قطع نظر لسانی نقطۂ نظر سے اس تاریخی واقعے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح جو زبان پنجاب میں بنی اس کا ملاپ دکن کے مقامی زبانوں سے ہوا۔ تیسرے دور کو ہم تین مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک کو گجری (گوجری) دوسرے کو جنوبی ہند (دکنی دور) اور تیسرے کو شمالی ہند (دہلی کا دور) کہتے ہیں۔

گجری (گوجری) دور: ۱۳۵۱ء تا ۱۷۰۰ء تک:

عربوں کا تعلق گجرات سے خصوصاً اور مالا بار، ملتان اور سندھ سے عموماً بہت قدیم رہا ہے۔ راجہ ولیتھ (۹۱۶ء) کے زمانے میں صرف لاڑ کے علاقے میں تقریباً دس ہزار مسلمان آباد تھے۔ جب سلطنتِ دہلی قائم ہوئی اور مسلمانوں کی فتوحات شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک پھیلیں تو یہ فاتح اپنے ساتھ اسی زبان کا ایک روپ جو سندھ، ملتان، خیبر پختون خوا اور پنجاب سے ہوتا ہوا دہلی پہنچا تھا، لے کر داخل ہوئے۔ یہاں ان زبانوں کے ملاپ سے جو زبان بنی اسے گجری (گوجری اردو) کہا گیا۔

گجرات پر ۱۲۹۷ء میں بیگ الغ خان اور ملک نصرت کی قیادت میں حملے ہوتے رہے لیکن جب علاوالدین نے ۱۳۵۱ء میں گجرات فتح کیا تو گجرات براہِ راست دہلی سلطنت کے قلمرَو میں آگیا چناں چہ مسلمانوں کی تہذیبی اثرات اور ان کی زبانیں یہاں پر اثر انداز ہونے لگیں۔ انتظامی سہولیات کی غرض سے علاوالدین خلجی نے سارے علاقے کو سو سو موضعات میں تقسیم کیا اور ہر موضع پر ایک ایک آفیسر جو شمال (دہلی سے بھیجا گیا تھا) مقرر کیا۔ یہ ترک آفیسر امیر صدہ کہلاتا۔ اسی طرح یہ امیر انِ صدہ یہاں رچ بس گئے اور یہاں کے مقامی زبانوں اور ترکی میں گفتگو کرنے لگے۔

دہلی سے گجرات ہجرت کرنے کا دوسرا بڑا واقعہ ۱۳۹۷ء کو پیش آیا۔ جب یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ امیر تیمور لشکرِ جرار کے ساتھ ہندوستان کے تختِ سلطنت دہلی پر حملہ کرنے آرہا ہے۔ ہزاروں لوگوں کے ساتھ سلطنتِ دہلی کا بادشاہ ناصر الدین محمود شاہ تغلق بھی اپنا پایۂ تخت چھوڑ کر گجرات آیا۔ ۱۳۹۸ء کو امیر تیمور نے دہلی کی اینٹ سے انیٹ بجادی۔

۱۴۰۱ء کو امیر تیمور کے دوبارہ حملے کی خبریں گردش کرنے لگی تو اسی زمانے میں فیروز شاہ بہمنی نے تیمور کے پاس اپنی سفارشات بھجوائیں۔ جواب میں امیر تہمور نے فیروز شاہ کو تحفے بھیجے اور ایک تحریری فرمان ارسال کیا کہ دکن، گجرات اور مالوہ فیروز شاہ کو عطا کیے گئے۔ تیموری حملے کی وجہ سے سلطنتِ دہلی کمزور ہوگئی اور کئی صوبے خود مختار ہوگئے۔ ان میں ایک صوبہ گجرات بھی تھا جس کے حاکم ظفر خان نے مظفر خان کا خطاب اختیار کرکے اپنے نام کا خطبہ پڑھا اور سکہ جاری کیا۔

جب گجرات میں اردو ادبی روایات کا آغاز ہوا تو اس وقت ایک طرف عربی و فارسی اور دوسری طرف سنسکرت زبان و ادب کی روایت تھی لیکن گجری ادب نے دونوں روایتوں کو رد کر کے خالص دیسی روایت کو اپنایا۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ عوامی زبان اردو، عوامی اصناف کے ساتھ ابھر رہی

ہے اور بھجن کی شکل میں گانے کے لیے مخصوص راگ راگنیوں کو سامنے رکھ کر شعر ترتیب دیے جا رہے ہیں، لیکن جب مغل ۱۵۷۲ء میں گجرات کو فتح کرتے ہیں تو اس میں فارسی روایات بھی شامل ہو جاتی ہیں۔

گجرات کی شعری وادبی روایات:

۱۔ **سید انوارالدین محمد، عرف ست گرو (م۔۱۰۹۴ء):** آپ نے ست پنتھی رسائل لکھے۔ ان رسائل میں ہندو وید اور یوگ کو اسلامی تصوف کے رنگ میں بھجنوں اور گیان کے روپ میں مرتب کیا گیا ہے۔

ست گرو کھے رے پیو پیو کرے　　　　بن پیو پیو نہ پاوے کوئے

مکھ جین تاں جو پیو ملے　　　　تو شر ساٹا نہ ہوے رے

۲۔ **سید برہان الدین ابو محمد عبد اللہ، قطبِ عالم (م۔۱۴۵۳ء):** آپ کے منہ سے یہ فقرے ادا ہوئے ہیں، جو اس دور کی زبان پر روشنی ڈالتے ہیں ۔

کیا ہے، لوہ ہے کہ لکڑ ہے کہ پتر ہے۔

چشتیوں نے پکائی انے بخاریوں نے کھائی۔

۳۔ **شاہ عالم ولدِ قطب عالم (م۔۱۴۸۳ء):** آپ کے یہ فقرے ملاحظہ ہوں جو اس دور کی زبان پر روشنی ڈالتے ہیں۔

کاکا فیروز چنگا ہے۔

نیچی بیری سب کوئی جھوڑے۔

پیر موا مرید جوگی ہوا۔

۴۔ **شاہ وجیہ الدین، علوی گجراتی (۱۵۰۴ء۔۱۵۸۹ء):** شیخ محمد غوث گوالیاری کے مرید تھے، درس و تدریس پیشہ تھا۔ ان کے مریدوں نے "بحر الحقائق" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا جس میں سوال فارسی میں ہے اور جواب شاہ صاحب نے اردو میں دیے ہیں۔ نمونہ:

اپنوں کو کیا کشف ہوئے یا نہ ہوئے کام اس کا ہے۔

رات دن خدا جنوں کی مدح کرے۔

اپنوں کو کیا فائدہ۔

ولیوں کیا صفتاں ہوتیاں ہیں

فقیر پر فرض تو نہیں۔

۵۔ **شیخ بہاء الدین باجن ۱۳۸۸ء۔۱۵۰۶ء):** آپ برہانپور کے رہنے والے اور شیخ معزالدین کے بیٹے تھے، ایک سو بائیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ "خزائن رحمت اللہ" کے نام سے فارسی میں ایک یادگار ہے۔ آپ کی شاعری تصوف کی نمایندہ شاعری ہے۔ آپ نے جکری (ذکری کی ہندی شکل) میں بنیادی طور پر ذکرِ خدا، ذکرِ رسولؐ، ذکرِ پیر و مرشد، ذکرِ تجرباتِ باطنی اور ورداتِ روحانی کو اس طور پر، ایسے اوزان اور ایسے عام فہم الفاظ میں

لکھا کہ اسے گایا بھی جا سکے اور سازوں کے ساتھ بجایا بھی جا سکے۔ ہئیت کے لحاظ سے جکری؛ بھجن اور گیت ہی کی ایک شکل ہے جس میں دوہروں کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔

باجن تیرا باولا تجھ کارن تیپے دھکے　　　　نبی محمدؐ مصطفیٰ میں نور جگ میں جھکے

۶۔ **قاضی محمود دریائی (۱۴۶۹ء۔۱۵۳۴ء):** گجرات کے برگزیدہ صوفیائے کرام میں سے ہیں۔ آپ گجرات کے خواجہ خضر کہلاتے ہیں۔ آپ سے بہت سے کرامات منسوب ہیں، لیکن آپ کی نمایاں خصوصیت جذبۂ عشق ہے۔ آپ کے کلام میں عشق کی وجہ سے گرمی پائی جاتی ہے۔ نمونۂ کلام:

امت نبی محمدؐ کی یہ　　　　محمود تیرا داس
برکت پیر چالیندھا　　　　سائیں پوروں من کی آس

۷۔ **شاہ علی محمد جیو گام دھنی (م۔۱۵۶۵ء):** شاہ ابراہیم کے بیٹے تھے۔ احمد آباد میں ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔ آپ کا کلام پہلی بار آپ کے مرید ابوالحسن ابنِ عبدالرحمٰن قریشی اور دوسری بار آپ کے پوتے سید ابراہیم ابنِ شاہ مصطفیٰ نے "جواہر اسرار اللہ" کے نام سے مرتب کیا۔ آپ نے اپنی ہر نظم کو مکاشفہ کہا ہے۔ مکاشفہ مختلف بندوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہر بند کو نکتہ کہتے تھے "جواہر اسرار اللہ" میں ایک سہ حرفی بھی ملتی ہے، جو پنجابی کی مقبول صنف ہے اور شاید یہ اردو میں اب تک کی سب سے پہلی سہ حرفی ہے۔ آپ کی شاعری کا مجموعی مزاج ہندی ہے جس پر ہندی اسطور، روایات اور رمزیات کا گہرا رنگ چڑھا ہے۔ نمونۂ کلام:

دوئی وجود کوں موجود ہونا یہ تو بات محال ہے لوگا
ایک حقیقت ہے گئی آچھے نمانوں کا ہے بھوگا

۸۔ **شیخ خوب محمد چشتی (م۔۱۶۱۴ء):** آپ کمال محمد سیستانی کے مرید تھے۔ آپ کو فارسی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ آپ کی فارسی کتاب "امواجِ خوبی" کے نام سے مشہور ہے۔ اردو کتاب "خوب ترنگ" ۱۵۷۸ء کو تصنیف کی اور چودہ سال بعد ۱۵۹۱ء کو "امواجِ خوبی" کے نام سے اس کی شرح لکھی۔ اس مثنوی میں تصوف اور اخلاق کے باریک موضوعات پر بحث کی گئی ہیں۔ اس مثنوی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی روایات رفتہ رفتہ ہندی روایات کی جگہ لے رہی ہیں۔

جیوں بغیر تھیں دیکھیں کب　　　　ولی بغیر نہیں دیکھیں کب
ہے بھی نہیں بھی کیا جانے　　　　مطلق قید مھیں نہیں آئے

اس کے علاوہ "چھند چھندان" خوب محمد چشتی کا ایک منظوم رسالہ ہے۔ اس میں مصنف نے فارسی عروض کو ہندی عروض کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ خوب محمد چشتی کو یہ کام کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی لیکن بدلتے ہوئے سیاسی اور تہذیبی حالات نے خوب محمد چشتی کو فارسی میں شرح لکھنے اور فارسی عروض کو سمجھانے کا احساس دلایا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی بار گجرات میں فارسی اوزان کو شاعری میں استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

پندرھویں صدی عیسوی میں یہاں ایک لغت "بحر الفضائل" لکھی گئی، جس کا مصنف فضل الدین بلخی ہے۔ بابِ چہاردہم میں ان ہندی الفاظ کو جمع کیا گیا ہے جو فارسی شاعری میں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

جنبھائی (جماہی)، پالک (ترپھلا)، گھرگھٹ (گرگٹ)، کنوار، چونہ، برہنتہ، جلاہہ، چکناچور، کوڈھ (کوڑھ)، دشانگی، سانڈ، جنجرو (گھونگھرو)، اکھروٹ (اخروٹ) سوڈر (سور) تانبہ، گدگدی، دھواں، گھوپھن، جوک، سیدھی، ستو، تتری (تتلی)، چیل، چوتڑ، پھرکی، لٹو، صفیل (فصیل)، سنداسی (سنڈاسی)، ماندر (بندر)، گونگہ (گونگا) وغیرہ۔ یہ لغت جغرافیہ، ہیئت، موسیقی اور عروض کی بابت بھی معلومات فراہم کرتا ہے۔

اکبر بادشاہ کی فتح گجرات (۱۵۷۲ء) کے ساتھ یہاں کے سلاطین کا پرانا نظام درہم برہم ہوا اور وہ ساری اقدار اور تہذیبی رشتے ٹوٹ گئے جن پر سلاطینِ گجرات کا سیاسی اور تہذیبی نظام قائم تھا۔ لہٰذا وہ زبان جو یہاں پروان چڑھ رہی تھی، مزید ترقی نہ کر سکی۔

دکنی دور (بہمنی دور ۱۳۵۱ء۔۱۵۱۸ء)

محمد تغلق بادشاہِ دہلی بنا تو اس جدت پسند بادشاہ نے دکن، گجرات اور مالوہ پر زیادہ بہتر طریقے سے حکومت کرنے کے لیے یہ فیصلہ کیا کہ دہلی کی بجائے دولت آباد کو پایۂ تخت بنایا جائے۔ چناں چہ اس نے ۱۳۲۷ء کو فرمان جاری کیا کہ تمام عمّالِ حکومت، آفسران اور متعلقینِ حکومت دولت آباد ہجرت کر جائیں۔ یہ ہجرت تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ دہلی کی آبادی کے ایک اہم حصّے کے دولت آباد پہنچنے کے عمل نے شمالی ہند کی تہذیب اور زبان کے اثرات کو تیز تر کر دیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ محمد تغلق کے آخری زمانۂ حکومت میں دکن کے امیر انِ صدہ نے بغاوت کر دی اور ایک امیر علاوالدین بہمن شاہ کو سلطان بنا کر بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ اب دکن کی سلطنت شمال کی طرف سے آئے ہوئے ان ترک خاندانوں کے ہاتھ میں تھی، جو خود کو دکنی کہنے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ دکنی ان کی زبان تھی جس پر انھوں نے دکنی قومیت کی بنیاد رکھی۔ یہ لوگ ایرانیوں کو غریب (مسافر) کے نام سے پکارتے تھے۔ اس سلطنت کی بنیاد چوں کہ شمال دشمنی پر رکھی گئی تھی اس لیے یہاں مقامی عناصر کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ یہاں (دکنی) اردو زبان کے پھلنے پھولنے کے مندرجہ ذیل عوامل تھے۔

۱۔ دکن میں اس وقت تین بڑی زبانیں تلنگی، کنڑی اور مرہٹی بولی جاتی تھیں۔ یہاں کوئی مشترک زبان نہ تھی، چناں چہ اردو نے سارے دکن میں مشترک زبان کا کام کیا۔

۲۔ دکن کے سیاسی حالات ابتر تھے، چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں، جو ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہتی تھیں۔ مسلمانوں نے یہاں اتحاد کا سبق دیا اور اردو زبان وسیع تر اتحاد کی اسی قوت کے سہارے سارے دکن میں پھیلی۔

۳۔ مسلمان تاجروں اور صوفیائے کرام نے اردو زبان کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا، جن میں سید شاہ مومن، باباسید مظہر عالم اور خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے کردار ادا کیا۔

بہمنی دور کے ادب میں مجموعی طور پر تین قسم کے موضوعات ملتے ہیں

۱۔ کسی دلچسپ، عجیب و غریب اور معروف قصّہ کو نظم کیا جاتا، جو نصیحت آموز ہوتی۔

۲۔ کسی مشہور مذہبی واقعہ کو نظم کیا جاتا۔

۳۔ تصوف اور اخلاق

غزل کا اس دور میں بھی کوئی وجود نہ تھا۔ ہندی آوزان عام طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ طویل نظم کا رواج تھا۔ اس دور کے اہلِ علم و ادب نے اپنی زبان کو ہندوی کہا ہے۔ اس دور میں اہلِ گجرات بھی اسے ہندوی کہا کرتے تھے۔

اس دور کی زبان کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

اس دور میں زبان تلفّظ کے سلسلے میں کسی اصول کی پابند نہ تھی۔

(ہ) اور (ھ) عام طور پر استعمال میں نہیں آتی تھیں۔ جیسے: مج (مجھ)، الجا (الجھا)، تج (تجھ)، اندے (اندھے)، سی، سوں، سیتی، نے اور تھی کے الفاظ (سے) کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔

مذکر اور مؤنث میں کوئی باقاعدگی نہیں تھی۔ املا کے باقاعدہ اصول مقرر نہ تھے۔ یائے معروف اور یائے مجہول میں کوئی فرق نہ تھا۔

ٹ، ڈ۔ ڑ، وغیرہ کو ت، د، ر، سے لکھا جاتا تھا۔ اسی طرح لکھی کا املا (لی کھی) اور مقیّد کو (موقید) لکھا جاتا تھا۔ (ز) کے بجائے (ج) کا استعمال عام تھا ۔(چ) جس کے معنی (ہی) کے ہوتے تھے، فعل، ضمیر، صفت سب کے ساتھ (چ) لگا کر (ہی) کے معنی میں آتے تھے۔ جیسے: ایہانچہ (یہاں ہی) وغیرہ۔

(جے) اور (جو) اگر کے معنوں میں آتے تھے۔

حروفِ عطف "ہور" بہ معنی "اور" استعمال کیا جاتا تھا۔

"اہے" جو سرائیکی، سندھی میں آج بھی مستعمل ہے۔ "اہیں" جمع کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

"اتھا" بہ معنی "تھا" اور "اتھے" بہ معنی "تھے" استعمال ہوتے تھے۔

جمع "اں" لگا کر بنائی جاتی تھیں۔

ماضی مطلق عام طور پر علامتِ مصدر (نا) گرانے کے بعد (یا) کا اضافہ کر کے بنایا جاتا تھا۔ جیسے: پڑھنا سے پڑھیا

قریبی آوازوں کے لیے قافیہ جائز سمجھا جاتا تھا۔ جیسے لڑکا قافیہ پر، پکڑ کا قافیہ پھر، وقت کا عقد، قصد کا سمت، نبی کا شفیع، وغیرہ

وہ الفاظ جن میں دو "ٹ" آتی تھیں، ان میں پہلی "ٹ" کو "ت" سے بدل دیتے تھے۔ ٹوٹیاں کو توٹیاں لکھتے تھے۔

دکنی میں گجری کی طرح سنسکرتی الفاظ بھی ملتے ہیں۔ جیسے: چتر، لوپ، سنسار

اس دور میں گجری کے الفاظ بھی دکنی میں رائج ہوئے، جیسے: آنچو (آنسو)، گدھڑا (گدھا)

مرہٹی کے الفاظ بھی دکنی اردو میں شامل ہو گئے، جیسے: کالوا (تالاب) گمت (تماشا) چاڑ (مٹھاس)

عربی، فارسی کے الفاظ کا املا اس طرح ملتا ہے۔ شیشہ کو شیشا، غصّہ کو غصا اور قبضہ کو قبضا لکھا جاتا تھا۔

گجری کی طرح اس دور میں دکنی میں بھی "ہار" اور "ین" لگا کر مرکب الفاظ بنائے جاتے تھے۔

آیئے اس دور کے زبان و ادب کے نمونے دیکھتے ہیں:

۱۔ حضرت شاہ برہان الدین غریب (م۔۱۳۲۷ء): آپ اپنے مرشد کے حکم سے ۱۳۲۵ء کو دکن آئے۔ بی بی عائشہ (بہن گنجِ شکر) کی لڑکی کو دیکھ کر ہنسے تو انھوں نے پوچھا:

"اساں دھی کو دیکھ کر دسن جی ضرورت کیڑھی ہے۔"

۲۔ زین الدین خلد آبادی (م۔۱۳۶۹ء): بستر مرگ پر تھے کہ کسی نے خیریت پوچھی، جواب دیا:

"منجہ مت بلاوؤ۔"

۳۔ فخر الدین نظامی: اس دور کی سب سے بڑی ادبی شخصیت فخر الدین نظامی ہے، جن کی مثنوی "کدم راؤ، پدم راؤ" ہے، جو اردو کی سب سے پہلی مثنوی ہے۔ اس مثنوی کا اب تک صرف ایک نسخہ معلوم ہے جو ناقص الاوسط ہے۔ اس کے علاوہ دو تین صفحات آخر کے بھی کم ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اس مثنوی کا اصل نام کیا ہے۔ مثنوی کے دو اہم کرداروں کی وجہ سے اس کا نام "کدم راؤ، پدم راؤ" رکھا گیا ہے۔ یہ مثنوی خاندانِ بہمنی کے نویں بادشاہ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی (۱۴۲۱ء۔ ۱۴۳۴ء) کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی میں دو اسلوب ملتے ہیں۔ ایک وہ اسلوب جس پر ہندی اروایت کا گہرا اثر ہے۔ جیسے؛

سنیا تھا کہ ناری دھرے بہت چھند   سو میں آج دیتھا تیری چھند پند

ناری (عورت) چھند (بات) دیتھا (دیکھنا)

دوسرا اسلوب جو فارسی اسلوب بیان کے قریب تھا، جیسے:

بھلے کوں بھلائی کرے کچھ نہوے   برے کو بھلائی کرے ہوے تو ہوے

"کدم راؤ، پدم راؤ" میں محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال بھی ہوا ہے، جیسے:

"سکھی آتیا جیو تو جہاں" (آپ سکھی، جہاں سکھی)

"نہوسی کدھیں پانچ انگل سمان" (پانچوں انگلیاں کبھی برابر نہیں ہوتی)

"پسار اپنا اوڑنا دیکھ پاؤ" جتنی چادر ہو اتنی پاؤں پھیلاؤ)

۴۔ میراں جی شمس العشاق (م۔ ۱۴۹۶ء) میراں جی کا موضوع تصوف ہے اور وہ شاعری کو نصیحت، تلقین اور اپنے مریدوں کی ہدایت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کی چار نظمیں ہم تک پہنچی ہیں۔

(ا)۔ خوش نامہ: ایک سو ستر اشعار پر مشتمل نظم ہے جو ہندی وزن پر لکھا گیا ہے۔ اس نظم میں خوش نامی ایک لڑکی کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔

کھندا خوش خوش نامہ تمت ہوا تمام   خوش سب کوئی دائم قائم جیتا خواص عوام

(ب)۔ خوش نعز: بہتر (۷۲) اشعار اور نو ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب میں اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ ہر باب کا پہلا مصرع خوش پوچھی یا خوش کہی سے شروع ہوتا ہے، خوش دریافت کرتا ہے اور میراں جی جواب دیتا ہے۔ یہ نظم بھی ہندی وزن پر ہے۔

(ج)۔ شہادت التحقیق: یہ ایک طویل نظم ہے جو ۵۶۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ وزن اس کا بھی ہندی ہے اور دوہے کی روایت یہاں بھی غالب ہے۔ ایک دوہے میں اپنی نظم کا نام بھی میراں جی نے ظاہر کیا ہے۔

اس نام ہے تحقیق   سن شہادت التحقیق

(د)۔ مغز مرغوب: یہ ایک مختصر نظم ہے جو آٹھ ابواب اور ۱۲۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نظم لمبی بحر میں ہے۔

اللہ، محمدؐ، علی، امام، دائم ان سوں حال   سب خاصوں سے اللہ اللہ تو رکھوں کہا کمال

۵۔ سید شاہ اشرف بیابانی (۱۴۵۹ء۔۱۵۲۸ء): سید شاہ ضیاء الدین بیابانی کے بڑے بیٹے تھے۔ فقیر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی تین تصانیف ہم تک پہنچے ہیں۔

(ا)۔ لازم المبتدی: ۱۹۸۱ اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم ہے، جسے ۳۶ عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ اس نظم میں مرد اور عورت کے ان مسائل کو بیان کیا گیا ہے جن کی ضرورت روزمرہ زندگی میں عام طور پر پڑتی ہیں۔

لازم المبتدی اس کا نام   پڑے جو ہر وقت آئے کام

اس نظم کی زبان صاف اور مشکل الفاظ سے پاک ہے۔

سنت غسل کی موجھیں پانچ   ہاتھ اور فرج کو دھونا سانچ

پلیتی دور کر کپڑے سوں   وضو کرنا پہل غسل سے

(ب)۔ واحد باری: عربی فارسی کی منظوم لغت ہے، جو امیر خسرو کی منظوم لغت "خالق باری" کی روایت سے تعلق رکھتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ "خالق باری" میں ذریعۂ اظہار فارسی میں ہے جب کہ "واحد باری" میں مروجہ زبان اردو ہے۔ اس نظم کو بھی آسان اور غیر پیچیدہ زبان میں لکھا گیا ہے۔

بحر ہے دریا آبِ فراخ   کلام موزوں ہے ڈالی شاخ

رباعی کیا؟ چو مصرع جان   مخمس کیا؟ پانچ مصرع خوان

(ج)۔ نو سرہار: اس مثنوی میں اشرف نے حضرت امام حسینؓ اور واقعہ کربلا کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اس مثنوی میں نو ابواب ہیں اور ہر باب ایک انمول ہار کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے اس کا نام نو سرہار رکھا گیا ہے۔۔ نو سرہار کی زبان صدیوں کی سفر کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس میں جو محاورے استعمال ہوئے ہیں، ان میں بہت سے آج بھی رائج ہیں۔ مثلاً: نانوں لینا (یاد کرنا) اُٹھ جانا (مر جانا) غم کرنا (فکر کرنا)

زینب جانوں اس کا نام   نین سلونے جیوں بادام

از حد صاحب حسن جمال   زیبا موزوں صورت جمال

ماتھا جانوں سورج پاٹ   یا کے جانوں چاند الاٹ

میراں جی کی طرح اشرف بھی اپنی زبان کو ہندی کہتا ہے۔ اشرف کی تینوں نظمیں ایک طرح کی ہندی اوزان میں لکھی گئی ہیں۔ محاورے کی چھوٹ اور عام بول چال کی زبان اور لہجے نے لسانی نقطۂ نظر سے اشرف کے کلام کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس دور میں اردو چاروں طرف پھیل کر دکن کی سب سے بڑی مشترک زبان بن گئی تھی۔ دکنی دور میں نظامی خالص ہندی روایات کا ترجمان ہے۔ میراں جی کے ہاں فارسی طرزِ احساس اور زبان کے اثرات قدرے زیادہ ہیں، جب کہ اشرف بیابانی کے ہاں تو یہ اثرات (ذخیرۂ الفاظ، آہنگ اور انداز بیاں) اور زیادہ ہو گئے ہیں۔

عادل شاہی دور (۱۴۹۰ء۔۱۶۸۵ء)

محمد شاہ بہمنی (۱۴۶۲ء ۔ ۱۴۸۲ء) کے دورِ سلطنت میں سلاطینِ عثمانیہ کا ایک شہزادہ اپنی جان بچا کر ایران سے ہوتا ہوا دکن پہنچا اور وزیر اعظم محمود گاوں کے سفارش پر شاہی چیلوں کے جرگے میں شامل ہو گیا۔ ذاتی قابلیت کی بدولت مجلس رفیع الملک الشرق کے خطاب سے سر فراز ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۴۸۵ء کو عادل خان کا خطاب پا کر بہمنی سلطنت کے صوبہ بیجاپور کا حاکم بنا دیا گیا۔ جب محمود شاہ بہمنی (۱۴۸۲ء۔۱۵۱۸ء) کے دورِ حکومت میں حالات بگڑے تو انھوں نے ۱۴۹۰ء کو اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔

سلطنتِ عثمانیہ کا یہ شہزادہ عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ تھا۔ یہ خود فارسی میں شعر کہتا اور شعراء اور اہلِ ذوق کی قدر دانی کرتا تھا۔ اس کے بیٹے اسماعیل عادل شاہ (۱۵۱۰ء۔ ۱۵۱۴ء) کو علم پروری اور ذوقِ شعری ورثے میں ملی تھی۔ وہ وفائی تخلص کرتا تھا اور فارسی میں شعر کہتا تھا۔

بہمنی دورِ حکومت میں شاہی دفتر ہندی میں کر دیے گئے تھے۔ یوسف عادل شاہ نے اپنے دورِ حکومت میں ہندوی کو ہٹا کر فارسی میں کر دیے لیکن ابراہیم عادل شاہ نے اسے شاہی دفتر کو پھر سے اردو میں کر دیا۔ گجرات کی بربادی (اکبر کے ہاتھوں ۱۵۷۲ء) بیجاپور کی آبادی کا باعث بنی۔ بہمنی ادب میں اور عادل شاہی ادب کے ابتدائی دور میں باہم امتیاز مشکل ہے۔ لسانی سطح پر بھی یہی حال ہے۔ جیسے: اچھا اور اس کے مشتقات؛ اچھہ، اچھوں، اچھے اور اچھو فاعل اور مفعول دونوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

اس دور میں مثنویوں کا دور دورہ تھا۔ عشق اس معاشرے کا اوڑھنا بچھونا تھا اور یہی شاعری کا مقبول موضوع بھی تھا۔ دوسرا موضوع بادشاہوں کے جنگ و جدل کے واقعات پر مبنی مثنویاں ہیں۔ عادل شاہی دور میں ابراہیم عادل شاہ (۱۶۰۲ء) تک شاعری ہندی اوزان میں کی جاتی تھیں۔ لیکن عبدل کے "ابراہیم نامہ" (۱۶۰۳ء) کے بعد یہاں فارسی اوزان اور بحور چھانے لگے۔

اصنافِ سخن میں مثنوی کے ساتھ ساتھ غزل کا رجحان بھی بڑھ رہا تھا۔ غزل کو صرف عورتوں سے باتیں کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ قصیدے کی صنف بھی اس دور میں ابھر رہی تھی۔ چوں کہ عادل شاہی بادشاہ زیادہ تر شیعہ تھے اس لیے مرثیہ کے خدوحال بھی اس دور میں ظاہر ہونے لگے۔ ہجو کی روایت بھی اسی دور میں سامنے آئی۔ یہ ہجو کہیں تو غزل کے کسی شعر میں ملتی ہے اور کہیں باقاعدہ موضوع کی شکل میں۔ عادل شاہی دور میں گیت اور دوہے کا رواج بھی موجود رہا۔ گیت دو قسم کے لکھے جاتے تھے۔ ایک قسم میں عشق و محبت کے جذبات کا اظہار کیا جاتا اور دوسری قسم میں تصوف اور مذہب کو موضوع بنایا گیا۔ نثر مذہبی موضوعات کے لیے مخصوص رہی اور تحریر پر ہندی کا رنگ غالب رہا۔

اس دور میں زبانوں کی ایک کھچڑی سی پکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جن میں مقامی زبانوں کے علاوہ کھڑی بولی، برج بھاشا، اودھی، سرائیکی، پنجابی، راجستانی، پشتو، سنسکرت اور گجراتی کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ اس دور میں قواعد کے کوئی اصول مقرر نہیں، مختلف زبانوں کے اصول ایک ساتھ استعمال میں آرہے ہیں۔ مثلاً:

جمع بنانے کے تین طریقے جیسے: "اں" لگا کر جمع بنایا جاتا، لوگ سے لوگاں

"وں" لگا کر جمع بنانا جیسے؛ میخ سے میخوں اور برج بھاشا کے اصول سے بھی جمع بنائی جاتی جیسے؛ نین سے نینن اور ڈنڈ سے ڈنڈن وغیرہ۔

مذکر مؤنث کے کوئی اصول متعین نہ تھے۔ اسی طرح املا کا بھی کوئی خاص اصول نہ تھا۔ "ک" اور "گ" میں عام طور پر کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح "ہ" اور "ھ" میں بھی کوئی فرق نہ تھا۔ قافیہ کا بھی کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ اس کے علاوہ زبان کی دیگر خصوصیات یہ تھیں۔

ا۔ اسماء سے فعل بنایا جاتا جیسے: چتر بہ معنی تصویر، اس سے چترانا (بہ معنی تصویر بنانا) بنایا گیا۔

۲۔عام طور پر لفظوں سے حرفِ علت (و) کم کر دیا جاتا جیسے: سرج (سورج) اپر (اوپر) وغیرہ

۳۔مشدّد حروف کو مخفف استعمال کیا جاتا جیسے: اول (اوّل)، غصا (غصّہ)

۴۔فاعل بنانے کے لیے "ہار" کا اضافہ کیا جاتا جیسے: کرن ہار، سرجن ہار

۵۔اگر فاعل جمع مؤنث ہوتا تو فعل بھی جمع مؤنث آتا جیسے: اکھرتیاں پھرتیاں

۶۔علامت فعل "نے" کا استعمال اس دور میں بھی کم تھا۔

۷۔افعالِ معاون کی یہ شکلیں تھیں: ہے، اہے، اہیں، تھا، اتھا، اتھے، اتھار، وغیرہ

۸۔ضمائر میں: میں، مجہ، مجے، میرا، ہوں، ہم، ہمن، ہمنا، توں، تجہ، وغیرہ

۹۔اسم ضمیر فعل کے آخر میں "چ" کے بڑھانے سے "ہی" کے معنی دیتے تھے۔ تونچ (تو ہی)

اس دور کی ادبی روایات درج ذیل ہیں:

۱۔برہان الدین جانم (م۔۱۵۸۲ء): میراں جی شمس العشاق کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے۔ آپ کی دو خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو آپ نے تصوف کے فلسفۂ وجودیہ کو مرتب کرکے اسے ایک باقاعدہ شکل دی اور دوسری یہ کہ تصوف اور شریعت و طریقت کو اپنی تصانیف نظم و نثر کے ذریعے پیش کیا۔ نظم میں "وصیت الہادی، بشارت الذکر، سکہ سہیلا، منفعت الایمان، فرمان از دیوان، حجت البقا، اور ارشاد نامہ" نمایندہ نظمیں ہیں۔ جب کہ نثر میں "کلمۃ الحقائق" اور "وجودیہ" (مشکوک) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے گیت، دوہے اور غزلیں بھی لکھی ہیں۔ نمونۂ کلام:

یو جانم لکھیا بول   لیہ یک یک معنا کھول

جے ہوویں لوگ عوام   بے مرشد بے خیام

۲۔ابراہیم عادل شاہ (۱۵۸۰ء۔۱۶۲۷ء): آپ ہندوستانی روایات کے شیدا تھے۔ دکنی مادری زبان تھی لیکن فارسی بھی خوب جانتے تھے۔ موسیقی اور شاعری سے آپ کو اتنا شغف تھا کہ موسیقی میں مہارت کی وجہ سے "جگت گرو" کہلائے۔ کتاب "نورس" آپ کے اس شوق کا ثبوت ہے۔ ایک گیت کا بول ملاحظہ ہو:

پیارے چاندا، اکھوں کتنتھ دیں دولی دکھی

من چاہے سو بھئی ہم کہ ہیں اب سکھی

(اے پیارے چاند! تجھے بتاوں کہ دن میں ہم کتنے دکھی رہتے ہیں۔ اس لیے کہ اب جب کہ دل پسند رات آگئی تو ہمیں خوش ہونا چاہیے۔)

۳۔عبدل بیجاپوری: اس کا پورا نام اور حالاتِ زندگی کسی کو معلوم نہیں، البتہ اس کا تخلص عبدلؔ تھا۔ اس نے ایک مثنوی "ابراہیم نامہ" (۱۶۰۳ء) لکھی جس میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کی ذات و صفات کو بیان کیا گیا۔ یہ مثنوی فارسی ہئیت اور فارسی بحر میں لکھی گئی۔ ناچنے گانے والیوں کی تصویریں دیکھیے، کتنی مکمل ہے۔

کوئی بالوں درمیاں یوں مانگ چیر   دسے جیوں کسوٹی میں سونے کی کیر

حسن حوض میں جیوں کنول دو لگیاں　　　کوئی اکھڑیاں رہ سو جو بنیاں

لسانی اعتبار سے عبدلؔ کے ہاں "چ" تاکیدی کا استعمال بالکل نہیں ہے، اسی طرح نکو (نہیں، نہ) جو دکنی کا کلیدی لفظ ہے۔ عبدلؔ کے ہاں استعمال نہیں ہوا۔ "ابراہیم نامہ" میں برج بھاشا کے ساتھ فارسی اور عربی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔

۴۔ **ملک خشنود:** یہ ایک غلام تھا جو خدیجہ سلطان کے ساتھ گول کنڈہ سے آیا تھا۔ انہوں نے اپنے حسنِ انتظام اور شاعرانہ قوت سے اتنا کمال پیدا کیا کہ بادشاہِ وقت محمد عادل شاہ نے ۱۶۳۵ء کو اسے سفیر بنا کر گول کنڈہ بھیجا۔ انہوں نے قصائد، مرثیے اور غزلیں لکھیں لیکن ان کی بیشتر چیزیں نایاب ہیں۔ البتہ "جنت سنگار" مثنوی، چند غزلیں اور ایک ہجو ہم تک پہنچی ہے۔ اس کی ایک غزل میں ناصحانہ انداز بھی ملتا ہے۔

اگر دنیا میں رکھنا ہے، تو رکھ ایماں سوں یارب
خزانا دے محبت کا رہوں تجھ دھیاں سوں یارب

۵۔ **کمال خاں رستمیؔ:** اسماعیل خان کا بیٹا تھا۔ اس کا خاندان چھے پشتوں سے دبیرِ شاہی کے عہدے پر فائز رہا۔ رستمیؔ نہ صرف علومِ مروجہ سے بہرہ ور تھا بلکہ فارسی قصائد اور غزلیات کی وجہ سے مشہور تھا۔ "خاور نامہ" آپ کی ایک طویل نظم ہے۔ جس میں ۲۴۰۰۰ اشعار ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی چند غزلیں بھی ہم تک پہنچی ہیں۔ نمونۂ کلام:

مسّی سوں چنچل سیج میں جب مست اوٹھے ہیں　　　شوخی سوں نین دو میری سدبد کو لوٹے ہیں
خوباں کرے وعدے کوں نکو رستمیؔ دل لاؤ　　　تحقیق کہے جس سوں وہی جھوٹ موٹے ہیں

۶۔ **حسن شوقیؔ (۱۵۶۴ء۔۱۶۳۳ء):** آپ کی صرف دو مثنویاں اور ۳۱ غزلیں ہم تک پہنچی ہیں۔ ایک مثنوی "فتح نامہ نظام شاہ" جو جنگِ تالیکوٹ (۱۵۶۴ء) کی فتح کے موقع پر لکھی گئی اور دوسری مثنوی "میزبانی نامہ" جو مظفر خاں کی لڑکی سے سلطان محمد شاہ کی شادی کے موقع پر لکھی گئی تھی۔ حسن شوقیؔ کی غزلیں اس روایت کا حصّہ ہے جس کے دوسرے سرے پر ولیؔ دکنی کھڑے ہیں۔ یہ غزلیں اپنے مزاج کے اعتبار سے جدید غزل کی ابتدائی روایت اور رنگ و روپ کا حصّہ ہے۔ نمونۂ کلام:

اگر مجنوں کی تربت پر گزر جاؤں، دیوانہ ہو　　　کہ مجنوں حال میرے کوں جو دیکھے در کفن لرزے
جب عاشقوں کی صف میں شوقیؔ غزل پڑھے تو　　　کوئی خسرو، ہلالی اور کوئی انوری کتے ہیں

۷۔ **علی عادل شاہ ثانی، شاہیؔ (۱۶۳۷ء۔۱۶۷۲ء):** سلطان محمد کا اکلوتا بیٹا اور عادل شاہی دربار کا آٹھواں بادشاہ ایک معمولی عورت کے بطن سے پیدا ہوا اور محمد قطب شاہ کی بیٹی (شہر بانو) کی گود میں پل کر جوان ہوا۔ انیس سال کی عمر میں بادشاہ بنا۔ فارسی میں شاعری کے ساتھ ساتھ دکنی اردو میں بھی شاعری کرتا تھا۔ شاہیؔ نے مختلف اصناف میں شاعری کی جن میں قصیدہ، مثنوی اور غزل شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مراثی، گیت، رباعی، پہیلی، فردیات، جھولنا، دوہرے، حمد، نعت اور منقبت بھی لکھے ہیں۔ شاعری میں عاشقانہ جذبات کی فراوانی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری میں لمس کا احساس بھی شدّت سے محسوس ہوتا ہے۔

تج نین کی نرمی کنے منگتے ہیں موتی آبرو　　　یا روپ کی توں کھان ہے یا حسن کا سمدور ہے

۸۔ محمد نصرت نصرتیؔ (م۔ ۱۶۷۴ء): شاعری کی اتنی دھوم تھی کہ لوگ اسے ملا نصرتی کہتے تھے۔ "گلشِ عشق، علی نامہ، اور تاریخِ اسکندریہ" جیسے مثنویوں کے خالق تھے۔ چند رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ جن میں حمد و نعت بھی ہیں۔ نصرتیؔ کی غزل میں ایک خصوصیت جو شاہی کی غزلوں میں کہیں نہیں ملتی، وہ جسم کو چھونے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی حسرت ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک نادیدہ پن اور عورت کو دیکھ کر رال ٹپکنے کا احساس ملتا ہے۔

ہے نصرتیؔ جگ میں جنم، حسن کا بھوکا نعمت تجہ ایسی پاکے یہ رہے دل صبور کیا

مذہبی تصانیف بھی یہاں لکھی گئیں جن کے نمائندہ غلام محمد داول (م۔۱۶۵۷ء)، شیخ محمود الحق خوش دَہاں، شاہ آمین الدین اعلیٰ (۱۵۸۱ء ۔۱۶۷۰ء) شامل ہیں۔ شیخ محمد داول کی چار نظمیں: "چہار شہادت، کشف الانوار، کشف الوجود اور ناری نامہ" ہم تک پہنچی ہیں۔ شاہ آمین الدین اعلیٰ سے بہت سے تصانیف یادگار ہیں، جن میں "محب نامہ، رموز السالکین، کلامِ آمیں الدین اعلیٰ اور وجودیہ" نظم کے علاوہ خیال، ریختہ اور غزلیں بھی شامل ہیں۔

اس دور کے دیگر مشہور شعرا یہ ہیں:

شہباز حسینن بیجاپوری، خواجہ محمد دہدار فانیؔ، آمینؔ، صنعتی بیجاپوری، سید میراں میاں ہاشمیؔ، عبدالمومن مومنؔ وغیرہ

قطب شاہی دور (۱۵۱۸ء ۱۶۸۶ء)

عادل شاہی سلطنت کے بانی یوسف خاں کی طرح ترک نژاد سلطان قلی بھی اپنی جان بچا کر ایران سے دکن آیا اور محمود شاہ بہمنی کے چیلوں کے جرگے میں شامل ہو گیا۔ سلطان قلی ہمدان کے بادشاہ اویس قلی کا بیٹا تھا۔ ۱۴۵۹ء کو اسے تلنگانہ کا صوبہ دار بنایا گیا۔ یہ بہمنی دور کا زوال تھا۔ ۱۵۱۰ء تک یہ صورتِ حال رہی کہ بادشاہ امیر برید کے قبضے میں نظر بند تھا۔ ۱۵۱۸ء تک آپ نے وفاداری کا ثبوت دیا اس کے بعد اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ایک ایسی سلطنت کی بنیاد رکھی جو دکن کی سرزمین پر تقریباً ایک سو اسی سال تک قائم رہی۔ انھوں نے گول کنڈہ کو محمد نگر کا نام دے کر سلطنت کا پایۂ تخت بنایا۔ بیجاپور سلطنت کی زبانیں کنڑی اور مرہٹی تھی جب کہ گول کنڈہ کی زبان تلگو تھی۔ یہاں کے بادشاہ شروع میں فارسی اور ترکی زبان بولتے تھے لیکن آخر میں اردو میں بات کرنے لگے۔

قطب شاہی سلطنت پر کل سات حکمران (سلطان قلی قطب شاہ، جمشید قلی، ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ) تخت نشین ہوئے۔ یہ سب بادشاہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ یہاں کی دفتری زبان ہمیشہ فارسی رہی، شیعہ مسلک سے تھے اس لیے ایران سے گہرے تعلقات قائم رکھے۔ فارسی زبان و ادب کی اہمیت یہاں زیادہ تھی۔ اس لیے فارسی اصنافِ سخن یہاں زیادہ ہیں؛ مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ یہاں کی مشہور اصناف ہیں۔ شاعری کا بنیادی موضوع عشق تھا۔ گول کنڈہ میں نثر کی بڑی روایت ملتی ہے۔ بیجاپور میں یہ روایت کمزور ہے۔ یہاں نثر عوامی سطح پر تبلیغی مقاصد کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ گول کنڈہ کی پہلی نثری تصنیف آج بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔

لسانی نقطۂ نظر سے گول کنڈہ کی زبان میں کم و بیش وہی خصوصیات ہیں جو بیجاپوری زبان میں ملتی ہیں۔ تذکیر و تانیث کے قاعدے، جمع واحد کے طریقے، فعل اور متعلقاتِ فعل کا استعمال، اسماء اور صفات میں "نا" لگا کر مصدر بنانے کا طریقہ۔ "چ" تاکیدی کا استعمال، متحرک اور ساکن لفظ میں بے قاعدگی، مستقبل کے لیے "سی" کا استعمال، حروف و اضافت کا جمع ہونا اور املا وغیرہ میں بے قاعدگیاں وغیرہ۔ البتہ گول کنڈہ کی زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ بیجاپور کی نسبت زیادہ ہیں۔

اس دور کے چیدہ چیدہ شعراء اور ادبا اور ان کا نمونہ کلام درج ذیل ہیں۔

۱۔ فیروز بیدریؔ: اس کا اصل نام قطب الدین قادری تھا۔ اس کی مثنوی "پرت نامہ" اور چند غزلیں ہم تک پہنچی ہیں۔ اس کی شاعری کا لہجہ اور اسلوب فارسی زدہ ہے۔ فیروز کی غزل ولیؔ دکنی کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ فیروز کی غزلوں کی زبان پر جہاں فارسی اسلوب کا اثر اسے ایک نئی ادبی شکل دے رہا ہے، وہاں پنجابی زبان کا بھی گہرا اثر ہے۔

گوریاں سہلیاں میں سب جگ کیاں بساریاں　　　جب سانولی سکھی سوں مائل ہوا دکن میں

۲۔ محمود: یہ ایک قادرالکلام شاعر تھے، جس نے اردو کے علاوہ فارسی، پشتو اور پنجابی میں بھی شاعری کی ہے۔ محمود کا بیشتر کلام غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جھولنا، مرثیہ، قصہ، کبت اور دوہرے بھی لکھے ہیں۔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ آپ کی ہر غزل میں مطلع اور مقطع ضرور ہوتا تھا۔ زلزلۂ خاک، نظارۂ وصفِ خدا، لوحِ دل، بیتابیِ عشق جیسی تراکیب سے آپ کی غزل میں ایک قسم کی تازگی کا احساس ملتا ہے۔

میرا حال دیکھ یک دیگر بولتے ہیں　　　عزیزاں اپنی سخت ہوتی جدائی

۳۔ محمد قلی قطب شاہ (۱۵۶۵ء۔ ۱۶۱۱ء): ابراہیم قطب شاہ کا بیٹا اور گول کنڈہ کا پانچواں بادشاہ تھا۔ باپ کی وفات کے بعد ۱۵۸۰ء کو تخت نشین ہوا۔ اعلیٰ ادبی ذوق کا مالک تھا۔ اس نے اپنے دور کے علماء اور شعراء کی دل کھول کے سرپرستی کی۔ اس کے دربار میں میر محمد مومن، ملا وجہی اور غواصی جیسے شاعر اور عالم موجود تھے۔ اس کی شاعری کی تہذیبی کینوس میں عربی، عجمی اور ہندوستانی تہذیب کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ مسلمان ہونے کے ناطے اس نے شبِ برات اور عیدِ میلاد النبیؐ پر نظمیں لکھی، عجمی روایت کا مظہر "نوروز" پر لکھی جانی والی نظمیں ہیں جب کہ بسنت، سرما، دیوالی اور برسات جیسی نظموں سے ہندوستانی تہذیب کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نے نہ صرف شاعری میں مقامی عناصر کو جگہ دی بلکہ عملی زندگی میں بھی مقامی تہذیب کے اثرات قبول کیے۔ اس نے آبائی لباس چھوڑ کر ہندوستانی لباس اختیار کیا۔ چہار مینار اس کے ذوقِ تعمیر کا آج بھی زندہ ثبوت ہے۔ حیدر آباد شہر اسی نے آباد کیا، محمد قلی ایک پُر گو اور پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ اس کا اردو دیوان اس کے داماد اور بھتیجے محمد قطب شاہ نے اپنے منظوم دیباچے کے ساتھ ۱۶۱۶ء کو مرتب کیا،۔ جس میں پچاس ہزار اشعار ہیں۔ اس نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلیات میں قصیدے، مثنویاں، مرثیے، غزلیں، قطعات، نظمیں اور رباعیات ملتی ہیں۔ اس کی شاعری میں تمام موضوعات ملتے ہیں لیکن اس کے دل چسپی کے دو مراکز ہیں ایک مذہب اور دوسرا عشق۔

دہن پستے، نیئں شکر ادھر بند پنکھڑی نازک　　کہ جوں خشخش نمن باریک ہے خوے مکھ پہ ناریاں کی

کجل نیناں سہلیاں کے سوپر مل سیام باداماں　　ٹھوڈی ہے سیب دسناجوں کے چار ولیاں ہیں چاریاں کی

(معشوق کے دہن پستے اور آنکھیں شکر کی طرح شیریں نظر آتی ہیں۔ اُن کے ہونٹ ان کھلی کلی کی طرح نازک معلوم ہوتے ہیں اور ان معشوق کے چہرے پر پسینے کی ننھی بوندیں خشخاش کے دانوں کی طرح باریک نظر آتی ہیں۔ ان کی کاجل لگی آنکھیں سیاہ باداموں کی طرح ہیں اور ٹھوڑی مثلِ سیب ہے۔)

اس کی شعری لغت پنجابی کے بہت قریب ہے۔ بعض اوقات تو یہ احساس ہوتا ہے کہ شعر کے چند لفظ بدل جائیں تو پنجابی زبان کا نمونہ ہو گا۔

۴۔ **شیخ احمد گجراتی:** اس نے اپنے دو مثنویاں محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں پیش کیں۔ ایک "لیلیٰ مجنون" دوسری "یوسف زلیخا" (۱۵۸۸ء) جو تقریباً چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی نظامیؔ کی "کدم راؤ، پدم راؤ" کے بعد اردو کی دوسری قدیم مثنوی ہے۔ اس مثنوی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنی زبان میں فارسی اور عربی کے الفاظ کم سے کم استعمال کیے ہیں۔

عرب الفاظ اس قصّے میں کم لیاؤں　　　　نہ عربی فارسی بھو تیک ملاؤں

۵۔ **ملا اسد اللہ خاں وجہیؔ (م۔۱۶۵۹ء):** قطب شاہی دربار کا ملک الشعراء تھا۔ فارسی کے علاوہ اردو شاعری اور نثر بھی لکھتا تھا۔ وجہیؔ سے کئی تصانیف یادگار ہیں۔ دیوانِ وجہ (فارسی)، مثنوی قطب مشتری اور نثر میں "سب رس" (۱۶۳۵ء) زیادہ اہم ہیں۔ قدیم بیاضوں میں چند غزلیں بھی ملی ہیں۔ قطب مشتری اردو کی قدیم مثنویوں میں سے ہے، جس میں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ اور اس کی محبوبہ "بھاگ متی" کی داستانِ عشق کو نظم کیا گیا ہے ، جو ایک رقاصہ تھی۔

یہاں بادشاہی غلامی اہے　　　　پو بدنامی نیں، نیک نامی اہے

محبت میں ہوتا جہاں جگ اسیر　　　　برابر اہے واں بادشاہ ہور فقیر

"سب رس" (۱۶۳۵ء) اردو میں ادبی نثر کا پہلا نمونہ ہے۔ اس سے پہلے جو نمونے ملتے ہیں اس میں ادبی شان نہیں ہے۔ "سب رس" محمد بن یحییٰ ابنِ سیبک فتاحی نیشاپوری کی تصنیف "دستور العشاق" (۱۴۳۶ء) کے نثری خلاصے قصہ "حسن و دل" سے ماخوذ ہے۔ وجہیؔ نے اس قصّے کو مسجع اور مقفیٰ نثر میں لکھا۔ تاریخی لحاظ سے "سب رس" کی اہمیت دوہری ہے، اولاً یہ کہ خالص اور بے مثل تمثیل کے لحاظ سے آج بھی منفرد ہے۔ ثانیاً یہ کہ اردو نثر کا پہلا ادبی کارنامہ ہے۔

"سب رس" میں اسلوب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی نثر پر فارسی کا اثر صرف الفاظ اور محاورات تک محدود نہیں بلکہ اس کے اسلوب، لہجے اور صرفی پہلو پر بھی چھایا ہوا ہے۔ وجہیؔ کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ فارسی اسلوب کو اس طور سے نظم میں ڈھالتا ہے کہ اردو نثر نہ صرف ایک نئے اسلوب سے آشنا ہوتی ہے، بلکہ یہ اسلوب آئندہ دور کے نثر نگاروں کے لیے ایک معیار بن جاتی ہے۔

۶۔ **عبد اللہ قطب شاہ (۱۶۱۴ء۔۱۶۷۲ء):** بارہ برس کی عمر میں بادشاہ بنا۔ شاعری کے رسیا تھے۔ کہتے ہیں کہ "جگت گرو" کی کتاب کے مقابلے میں اس نے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس کی زبان پر فارسی زبان کا گہرا اثر ہے۔

چنگ ہور رباب مست ہوئے تھے آپس منے　　　　لذت سوں راگ رنگ میں تو بے حساب تھا

۷۔ **غواصی:** عبد اللہ قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ شروع میں فوج کے سپاہی تھے لیکن ایک قصیدے کی وجہ سے قسمت کا ستارہ چمکا اور ۱۶۳۵ء کو عبد اللہ قطب شاہ نے اسے بیجاپور کے سفیر ملک خشنود کے ہمراہ گول کنڈہ کا سفیر بنا کر روانہ کیا۔ کلیات کے علاوہ تین مثنویاں؛ مینا ستونتی، سیف الملوک و بدیع جمال اور طوطی نامہ یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ قصیدے، غزلیں، رباعیات، ترکیب بند اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔ حسن و عشق غواصی کا خاص موضوع تھا۔

کھلے سر تھے گلزار الحمد للہ　　　　اُٹھیا جگ میں مہکا الحمد للہ

سوئے بخت میرے جو تھے آج لگ سو دیے جاگ یک بار الحمدللہ

۸۔ **شیخ محمد مظہر الدین ابنِ نشاطی:** اس نے ایک مثنوی "پھول بن" کے نام سے ۱۶۵۵ء کو دکنی میں نظم کی۔ ابنِ نشاطی نے ۱۷۴۴ اشعار کی اس مثنوی میں اپنے شاعرانہ جوہر دکھائے ہیں۔ اس کی خصوصیت اس کا زورِ بیان ہے۔ اس میں عربی و فارسی کے الفاظ صحتِ املاء و تلفّظ کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔

اس دور کے دیگر نامور شعراء میں ملاخیالیؔ، قطب رازیؔ، سید بلاقیؔ، طبعیؔ، فتاحیؔ، حسین ذوقیؔ، اور قاضی محمود بحریؔ قابلِ ذکر ہیں۔

اس دور کا اردو نثر:

۱۔ **میراں جی حسین خدانما (۱۵۹۰ء۔ ۱۶۶۳ء):** عبداللہ قطب شاہ کے سرکار میں سواروں کے جمعہ دار تھے۔ بادشاہ نے سفارت پر بھیجا تو واپسی پر آمین الدین اعلیٰ سے ملاقات ہوئی۔ یہ اس کے مرید ہوگئے، چناں چہ شاہی ملازمت ترک کی اور یادِ الٰہی میں مصروف ہوگئے۔ اس نے؛ چہار وجود، شرحِ تمہیداتِ ہمدانی اور رسالہ قربیہ یادگار چھوڑی ہیں۔

"چہار وجود" میں سوال و جواب کی شکل میں تصوف پر بحث کی ہے۔ اس کی نثر پر فارسی اور عربی کا غلبہ ہے۔ "تمہیداتِ ہمدانی" عربی زبان کی مشہور کتاب ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے فارسی زبان میں اس کی شرح لکھی۔ میراں جی نے گیسو درازؒ کی شرح کا دکنی اردو میں ترجمہ کیا۔ آپ کی نثر ناہموار ہے، کہیں عبارت صاف ہے اور کہیں گنجلک، البتہ یہاں وضاحت اور قوتِ اظہار موجود ہے۔

۲۔ **میراں یعقوب:** اس نے خدانما سے فیض پایا ہے۔ "شمائل الاتقیا" خدانما کی نثر کی روایت کو آگے بڑھاتی ہے۔ یہ چوں کہ رکن عماء الدین کی کتاب کا دکنی اردو میں ترجمہ ہے، اس لیے اس میں موضوع سے زیادہ اسلوب کی اہمیت ہے۔ اس میں میراں یعقوب نے نہ صرف فارسی اشعار کا ترجمہ کیا بلکہ تصوف اور شریعت کی اصطلاحات کو اردو کا جامہ بھی پہنایا۔

شمالی ہند میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء (۱۳۲۷ء۔ ۱۷۰۰ء):

محمد تغلق نے ۱۳۲۷ء کو دہلی کی جگہ دولت آباد کو دارالخلافہ بنایا لیکن ایک سال کے اندر اندر اس نے اپنا فیصلہ واپس لیا اور دہلی واپس چلا آیا۔ محمد تغلق کے بعد فیروز تغلق نے اقتدار سنبھالا۔ جس کی وفات (۱۳۸۸ء) پر تخت کے دعوے داروں میں خانہ جنگی ہوئی اور حکومتِ دہلی کا اقتدار کمزور ہو گیا۔ رہا سہا اقتدار امیر تیمور کے حملے نے مٹا دیا۔ انہوں نے یہاں سے جاتے ہوئے ملتان کے حاکم خضر خان کو پنجاب اور دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا، جو کئی سالوں تک یہاں کی مقامی امیروں سے لڑ جھگڑ کر آخر کار ۱۴۱۴ء کو تختِ دہلی پر قابض ہو گیا اور خاندانِ سادات کی بنیاد رکھی۔ اس خاندان کے آخری بادشاہ کو لاہور کے صوبے دار بہلول لودھی نے کئی بار جون پور اور مالوے کے مسلمان بادشاہوں سے بچایا۔ لیکن پھر مجبوراً (۱۴۵۱ء) کو دہلی کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کی وفات پر ۱۴۸۹ء کو سکندر لودھی تخت نشین ہوا جس نے آگرہ شہر کی بنیاد رکھی اور اسے اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس کی وفات ۱۵۱۷ء کو ابراہیم لودھی باشاہ بنا۔

لودھی خاندان کے اقتدار کا خاتمہ امیر تیمور کے پڑپوتے ظہیر الدین بابر کے ہاتھوں ہوا۔ جس نے ۱۵۲۶ء کو ابراہیم لودھی کو شکست دے کر عظیم مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ بابر نے دہلی کی سلطنت حاصل کرنے کے بعد بنگال، گجرات اور دکن کے سوا باقی شمالی اقطاع اور کابل کا سارا علاقہ مغلیہ سلطنت میں شامل کیا۔ ۱۵۳۰ء کو بابر کی وفات کے بعد ہمایون وارثِ تخت ہوا اور دس سال تک مغل سلطنت کی توسیع میں کوشاں رہا۔ ۱۵۴۰ء کو

ایک پٹھان سردار فرید خان (شیر شاہ سوری) نے ہمایون سے حکومت چھینی اور ہمایون نے ایران میں پناہ لی۔ وہاں سے فوجی امداد حاصل کر کے ۱۵۵۵ء کو دوبارہ سلطنت پر قبضہ کیا لیکن سات ماہ کے بعد ایک حادثہ میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد اکبر بادشاہ بنا جس کی طویل دورِ حکومت (۱۵۵۵ء۔۱۶۰۵ء) میں کشمیر و افغانستان سے لے کر احمد نگر تک اور گجرات سے لے کر بنگال تک سارا علاقہ مغلیہ سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اس کے جہانگیر ۱۶۰۵ء کو دہلی سلطنت کا بادشاہ بنا۔

شاہ جہان ۱۶۲۷ء کو تخت نشین ہوا۔ اس نے نظام شاہی سلطنت کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ ۱۶۵۷ء جب شاہ جہاں بیمار ہوا تو اس کے بڑے بیٹے دارا شکوہ نے سب اختیاراتِ سلطنت سنبھال لیے۔ اس کے باقی تینوں بھائیوں نے بھی تخت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن آخر کار اس کوشش میں اورنگزیب عالمگیر ۱۶۵۷ء کو کامیاب ہوا۔ اس نے ۱۶۸۶ء کو بیجاپور اور ۱۶۸۷ء کو گول کنڈہ کی ریاستوں کو جو شاہ جہاں کے وقت سے باج گزار تھیں، اپنی سلطنت میں شامل کیے۔

شمالی ہند کے تمام بادشاہوں کے دور میں درباری زبان فارسی تھی۔ شعراء اسی زبان میں دادِ سخن دے رہے تھے اور انعامات و اکرامات وصول کر رہے تھے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہانگیر بادشاہ نے داستان گو ملا اسد، نئے نواز محمد نائی اور شاعر سعید کو سونے میں تلوا دیا تھا، اسی طرح شاہ جہاں کو حاجی محمد خاں قدسی کا قصیدہ اتنا پسند آیا کہ اس کا منہ سات مرتبہ موتیوں سے بھروایا گیا۔ ایسے ماحول میں فارسی زبان کو چھوڑ کر ہندی میں کون بے وقوف شاعری کرتا۔ تاہم صوفیائے کرام نے عوام سے عوام کی زبان (ہندی) میں بات کی اور اس طرح بالواسطہ طور پر ان کی یہ کوشش زبانِ اردو کی ترویج کا باعث بنی۔

اس دور کے چند نامور صوفیاء، علماء، شعراء اور مبلغین کے علمی آثار پر نظر ڈالتے ہیں:

۱۔ شیخ عبد القدوس گنگوہی (۱۴۵۵ء۔۱۵۳۸ء): آپ برج بھاشا کے شاعر تھے اور الکھ داس تخلص کرتے تھے۔ ہندی زبان کا مزاج آپ پر اتنا حاوی تھا کہ آپ بات بات میں دوہے اور اشعار لاتے تھے۔ یہ رنگ آپ کے خطوط میں بھی ملتا ہے۔ آپ کی تصنیف "رشد نامہ" میں اس دور کی زبان میں شر لوک، چوندہ، عقدہ، سبد، اور دوہرے ملتے ہیں۔ جن کی تعداد ۲۷ ہیں۔ سبد ملاحظہ ہوں:

نہ کچھ نہ کچھ نہ کچھ جاں　　　　نہ کچھ میں نہ کچھ مدنہ کچھ پرواں

۲۔ نام دیو (۱۲۷۰ء۔ ۱۳۵۰ء): مرہٹی زبان کا شاعر تھا لیکن "گرو گرنتھ صاحب" میں اس کا جو کلام درج ہے وہ اس نئی زبان میں ہے، جسے ہندی یا اردو کہتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

مائے نہ ہوتی، باپ نہ ہوتا، کرم نہ ہوتی کائیا　　　　ہم نہ ہوتے تم نہ ہوتے، کون کہاں تے آئیا

چند فقرے بھی آپ سے منسوب ہیں:

میں گریب (غریب) میں مسکین تیرا نام ہے آدھارا

کریمار حیما (رحیا) اللہ توگنی (غنی)

تو دانا تو بینا میں بیمار کیا کری

۳۔ کبیر داس (م۔ ۱۵۱۸ء): بنارس کا رہنے والا اور ذات کا جولاہا تھا۔ مذہب کی تفریق کو برا سمجھتا تھا۔ توحید کی تلقین ان کا ایمان تھا۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ عشق ہی عرفانِ ذات کا ذریعہ ہے اور اسی سے روح کو سکون ملتا ہے۔ کبیر کے کلام کے دو مجموعے "بیجک" اور "بانی" ہیں۔ ان کا کلام شمالی ہند میں اردو زبان کی ترویج کے لیے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

وہی مہادیو، وہی محمدؐ، برھما آدم کہیے — کوئی ہندو کوئی ترک کہاوے ایک جمی پر رہے

کل کرے سو آج کر آج کرے سو اب کر — پل میں پرے ہوئے گی پھیر کرے گا کب!

۴۔ گرونانک: گرونانک نے کبیر کو اپنا پیشوا کہا ہے۔ آپ کا بیشتر کلام پنجابی میں ہے جس پر اردو زبان کے مروجہ ذخیرۂ الفاظ کا رنگ بہت گہرا ہے۔ "گرو گرنتھ صاحب" میں اس نے اپنے خیالات کی تبلیغ کے لیے اسی زبان کا سہارا لیا ہے۔

پاکی نائیں پاک تھائیں سچا پرود گار (پروردگار)

پیر پیکامبر (پیغمبر) اور سہید (شہید)

سیک مسائک (شیخ مشائخ) کاجی (قاضی) ملا

"گرونانک کے ہاں بھی عربی فارسی الفاظ اسی طرح ہندی سانچے اور تلفّظ میں ڈھل رہے ہیں جس طرح کبیر کے ہاں نظر آتے ہیں۔ گرو گرنتھ صاحب" میں عربی فارسی الفاظ کی تعداد تقریباً ۱۳۴۳ ہیں، جو آج بھی اردو میں مستعمل ہیں۔

۵۔ شیخ جمالی کنبوہ (م۔ ۱۵۳۵ء): اکبر اعظم کے دور میں فارسی کے شاعر تھے۔ جس کا تذکرہ "سیر العارفین" مشہور ہے۔ آپ نے فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شعر گوئی کی ہے۔

خوار شدم زار شدم لٹ گیا — دردِ عشق سے کمر ٹٹا (ٹوٹا) ہے

آں پری رخسار چوں شانہ بہ چوٹی می کند — جاں دراز عاشقاں را عمر چھوٹی می کند

۶۔ حکیم یوسفی: یہ سکندر لودھی سے لے کر ہمایوں کے عہد تک زندہ رہا۔ انہوں نے ایک قصیدہ "در لغاتِ ہندی" لکھا، جس میں مختلف اشیا اور دواؤں کے فارسی ناموں کے اردو مترادفات قلم بند کیے۔ یہ منظوم رسالہ "خالق باری" کے طرز پر طلبا کے فائدے کے لیے لکھا گیا تھا۔

آنکہ چشم وناک بینی، بوں آبرو، ہوتہ لب — دند دنداں، کارہ گردن، گوتہ زانو، مونڈ سر

۷۔ پیر روشان (م۔ ۱۵۷۲ء): پیر روشان خیبر پختون خوا کا وہ درخشاں ستارہ ہے جس نے مذہبی کتاب کی صورت میں اس زبان کی ترویج و ترقی میں خونِ جگر شامل کیا۔ آپ کی سب سے اہم مذہبی کتاب "خیر البیان" ہے۔ جس میں بیک وقت چار زبانوں عربی، فارسی، پشتو اور اردو میں شرعی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ "خیر البیان" کی نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"اے بایزید لکھ وہ اکھر جسے سب جیب سہن جڑ تھیں اس کارن جسے نفع پاویں آدمیاں کچ کا۔ میں ناہیں جانتا ہین قرآن کے اکھر ہے۔ سبحان اے بایزید لکھنا اکھر کا تجھے ہے دکھلاونا اور سکھلاونا مجھے"

"" خیر البیان" کی زبان پر برصغیر ہند و پاک کی مختلف زبانوں کے اثرات نظر آرہے ہیں اور ایک ایسی عالمگیر زبان بنتی دکھائی دے رہی ہے جس کے ذریعے مختلف علاقوں کے لوگ اس میں اپنی دل کی بات کہہ سکیں۔

اکبر کے دور میں شمالی ہند کی یہ زبان ادبی معیار کے قابل ہوئی۔ اس میں ادباء نے شعوری طور پر ادبی تصانیف لکھنے کی کوشش کی۔ چناں چہ بہرام سقہ بخاری، ملانوری اور عشقی خان عشقی نے اس زبان میں شعوری طور پر شاعری کی۔

۸۔ بہرام سقہ بخاری: اگرچہ ترکی اور فارسی کا شاعر تھا لیکن کبھی کبھی اردو میں بھی شاعری کرتا تھا۔ اس کی شاعری میں بحر، ہئیت اور مجموعی مزاج فارسی کا اور ردیف اور قافیہ اردو کا ہے۔ اس کا مشہور قصیدہ "سرد گرم زمانہ" ہے۔ جس میں ترکی کے ساتھ اردو کے اشعار بھی شامل ہیں۔

تم جوں مجھ کو پیار کرتے ہو	ہوں بھی کرتی ہوں تمھارہ پیار	
اپنے کوتھے پہ میں بچھاوں پلنگ	اوس او پر لیت جاؤ پاؤں پسار	(کوٹھے، لیٹ)

جہانگیر ایک ہندو رانی کے بطن سے پیدا ہوا تھا لہٰذا وہ اپنی مادری زبان سے بخوبی واقف تھا۔ "تزکِ جہانگیری" میں اس نے کثرت سے اس زبان کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ چند الفاظ درج ذیل ہیں:

"چنبہ، تالاب، گھڑی، سنگھاسن، بلی، تھانہ، لوٹا، پکا، کٹوری، کھچڑی، باجرہ، چوکیدار، چبوترہ اور جھروکہ وغیرہ"

۹۔ محمد افضل، افضل پانی پتی (م۔۱۶۲۷ء): اس دور کی سب سے اہم کاوش محمد افضل کی "بارہ ماسہ" ہے۔ افضل نے "بکٹ کہانی" بارہ ماسہ کی روایت میں لکھی۔ یہ ایک عوامی صنف ہے جس میں ایک عورت بارہ مہینوں کی وساطت سے ہجر و فراق کی کیفیات نسوانی لہجے میں بیان کرتی ہے۔ افضل نے اسی عوامی صنف میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں:

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی	بھئی ہوں عشق کے غم سوں دِوانی
ارے یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے	کہ جس کے آگ سے سب جگ جلا ہے
اری آساں نہ جانو عشق کرنا	تمن اس آگ میں ہر گز نہ پڑنا

شاہ جہاں اسی زبان میں گفتگو کر سکتا تھا، اگرچہ اُس کے دور میں ہمیں "بکٹ کہانی" جیسا ادب پارہ نہیں ملتا؛ البتہ دو ایک غزلیں ایسی مل جاتی ہیں جن کے مطالعے سے اس دور کی زبان کا رنگ، روپ اور نوعیت کا پتا چلتا ہے۔

۱۰۔ منشی ولی رام ولیؔ: یہ عربی، فارسی اور ہندی میں شعر کہتے تھے۔

چہ دل داری دریں دنیا کہ دنیا سے چلا جاتا ہے	چہ دل ہندی دریں عالم کہ سر پر چھوڑ جاتا ہے

۱۱۔ پنڈت چندر بھان برہمن (۱۵۷۴ء۔ ۱۶۶۲ء): یہ شاہجہاں کے وزیر تھے اور "رائے رایاں" کے خطاب سے نوازے گئے۔ ان کی غزل کی زبان اور لہجے میں نہ صرف فارسی غزل کی رچاوٹ ملتی ہے بلکہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس زبان میں اتنی قوتِ اظہار پیدا ہو گئی ہے کہ جذبات اور احساسات کو تیکھے پن کے ساتھ بیان جا سکتا ہے۔ نمونۂ کلام:

خدا نے کس شہر کے اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے	نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے
پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کیسے	نہ تسبی ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے

اورنگزیب عالمگیر کے دور میں اردو زبان فارسی کی جگہ آہستہ آہستہ لے رہی تھی۔ اس دور میں اردو زبان مدرسوں اور مکتبوں میں عام طور پر ذریعۂ تعلیم بن رہی تھی۔ اورنگزیب کے زمانے میں ایسی کتابیں کثرت سے نقل کی جاتی رہیں جو فارسی میں لکھی ہوئی تھیں۔

۱۲۔ میر عبد الواسع ہانسوی: "غرائب اللغات" کے مصنّف کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ وہ ایک معلّم تھے اور طلبا کے فائدے کے لیے آپ نے بہت سی کتابیں لکھیں، جن میں؛ رسالہ عبد الواسع، شرح بوستان، شرحِ زلیخا اور صمد باری معروف بہ جان پہچان شامل ہیں۔

"غرائب اللغات" اردو کی پہلی لغت ہے جس میں ایسے الفاظ کے معنی لکھے گئے ہیں جو فارسی لغات میں نہیں ملتے۔ "صمد باری" اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس لغت میں عربی، فارسی اور اردو کے ہم معنی الفاظ، اشعار میں بیان کیے گئے ہیں۔

عبد الواسع کی یہ کتاب — تین زبانوں کی ہے یہ نصاب

خواندن، نوشتن، فہمیدن جانو — پڑھنا، لکھنا، سمجھنا جانو

آوردن، بردن، سوختن کہیے — لانا، لے جانا، جلانا کہیے

اس دور میں خواص کے فائدے کے لیے اردو زبان میں مذہبی کتابیں تصنیف ہونے لگیں، چناں چہ مولانا شیخ عبد اللہ انصاری کا "فقہ ہندی" ایک ایسا ہی رسالہ ہے جس میں اسلامی فقہ اور شرعی مسائل کو شعر کا جامہ پہنا کر اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ عام آدمی (مرد و عورت) دونوں اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

۱۳۔ شیخ محبوب عالم: مذہبی تصانیف کے سلسلے میں ایک اہم نام شیخ محبوب عالم کا ہے۔ یہ تین تصانیف؛ محشر نامہ، مسائل ہندی اور درد نامہ کا مصنّف ہے۔ "محشر نامہ" کی زبان قدامت لیے ہوئے ہے۔ "مسائل ہندی" کی زبان نسبتاً صاف ہے۔

کہے عشق سوں نعت احمد رسول — دو عالم میں ہو جائے مقبول پھول

۱۴۔ شیخ ناصر علی سرہندی (۱۶۹۷ء): اورنگزیب عالمگیر کے دور کے غزل گو تھے۔ ان کی جو غزلیں ملی ہیں ان میں فارسی زبان کی رچاوٹ اور فارسی مضامین کو اردو کا جامہ پہنانے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔

سجن کے حسن کا قرآن پڑھیا ہے میں نظر کر کر — نہیں پائی غلط اوس میں دیکھیا زیر و زبر کر کر

مغل حکمران اورنگزیب کی فتح دکن ۱۶۸۷ء کے بعد شمال اور جنوب تقریباً سوا تین سو سال بعد پھر سے ایک ہو جاتے ہیں۔ اس فتح سے اردو زبان کا نیا اسلوب ریختہ کے نام سے علاقائی سطحوں سے اُٹھ کر ہمہ گیر سطح پر سارے برعظیم کے لیے قابلِ قبول ہو جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ اردو زبان و ادب کی علاقائی تخصیص ختم ہو جاتی ہے اور شمال، جنوب، مشرق اور مغرب ہر جگہ زبان کا ایک ہی ادبی معیار مقرر ہو جاتا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایک تہذیب یافتہ قوم فاتحین سے شکست کھا کر پسپا ضرور ہو جاتی ہے لیکن اس کی تہذیب دیکھتے ہی دیکھتے خود فاتح کی تہذیب کو فتح کر لیتی ہے۔ تہذیبی فتح زمینی فتح سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ عالمگیر نے دکن کو فتح کیا تو ولی دکنی کی شاعری نے دہلی کو فتح کیا اور زبان و بیان کے اس نئے معیار کا آغاز ہوا، جسے برسوں تک ریختہ کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ اس دور کی مقبول ترین صنف غزل رہی۔ دراصل ریختہ، ہندی/ہندوی، گجری، دکنی اور دہلوی کی وہ ارتقائی شکل تھی جس کے ساتھ ہی اردو زبان و بیان کا علاقائی رنگ و روپ بھی ختم ہو گیا۔ ریختہ کے تین بنیادی خصوصیات یہ ہیں؛

۱۔ اس زبان نے فارسی زبان کی پیروی کو اپنا وطیرہ بنایا۔

۲۔ بے ساختگی اس کی بنیادی خصوصیت قرار پائی۔

۳۔ زبان و بیان کا یہ نیا ملک گیر روپ ایسا تھا جو بے تکلف سب کی سمجھ میں آتا تھا۔

ولی دکنی : ریختہ کا نمایندہ شاعر ولی دکنی (ولی محمد) ہے۔ ولی کے حالاتِ زندگی معلوم نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو تھوڑے بہت معلوم ہوئے ہیں، ان میں بھی ناقدین نے اس کا سن پیدائش ۱۶۶۸ء اور وفات ۱۷۰۷ء قرار دیا ہے۔ اس طرح اس کے وطن کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ کوئی اسے گجراتی اور کوئی اسے اورنگ آبادی کہتے ہیں۔ ولی وہ پہلے شاعر تھے جس نے اردو شاعری کو وہ مخصوص رنگ و روپ دیا جو ان سے پہلے اردو شاعری کو نصیب نہ ہوا تھا۔

ولی کے ہاں فارسی روایات اردو مزاج سے شیر وشکر ہو کر ایسی شکل بنا رہی ہے، جس میں ہندوی روح کی جھلک بھی ہے اور ایرانی روح کی آواز بھی، جسے عرفِ عام میں "مسلم ثقافت" کہتے ہیں۔ جب ولی دکنی نے غزل کو اظہار کا ذریعہ بنایا تو اس وقت غزل کے موضوعات کو صرف "عورتوں سے باتیں کرنا" تک محدود کر دیا گیا تھا۔ ولی نے غزل میں مختلف النوع موضوعات کا اضافہ کیا جس سے غزل میں تنوع پیدا ہوئی۔ ولی دکنی نے اپنی زندگی میں دو شاعروں کا کام کیا۔

(ا) ولی دکنی نے شمال اور جنوب کی زبانوں کو ملا کر ایک ایسا روپ دیا جو بیک وقت دونوں کے لیے قابلِ قبول تھا۔ اظہار کے اس روپ نے اردو کو فارسی کی جگہ پر بیٹھا دیا۔

(ب) ولی دکنی نے غزل کو وارداتِ قلبیہ کے اظہار کا ایسا ذریعہ بنایا، جس میں زندگی کے ہر رنگ کے تجربات کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ نمونۂ کلام

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد	طالبِ عشق ہوا، صورت انسان میں آ
عشق کے راہ کے مسافر کوں	ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہے

دلچسپ بات یہ ہے کہ ولی کے ہاں زبان کا ارتقاء ایک طرف دکنی سے ریختہ کی طرف اور دوسری طرف ریختہ سے اردو معلّٰی کی طرف ہو رہا ہے۔ ولی نے فارسی زبان سے دل کھول کر استفادہ کیا اور فارسی کے روزمرہ، محاورہ، ضرب الامثال اور اشعار کو ریختہ کے قالب میں ڈھالا۔ غزل ولی کے ہاں بنیادی صنفِ سخن کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی وجہ سے ولی دکنی کو اردو غزل کا "باوا آدم" کہتے ہیں۔ اس دور میں ولی سے بہت سے شاعر متاثر ہوئے جن میں سید محمد فراقی، فقیر اللہ آزاد اور سید سراج الدین اورنگ آبادی کافی مشہور ہیں۔

ایہام گوئی کی تحریک

ایہام رعایتِ لفظی کے ایک مخصوص انداز کا نام ہے اور اس کا تمام تر دارومدار ذو معنی الفاظ کے فنکارانہ استعمال پر ہے۔ ایہام سے مراد یہ ہے کہ شاعر پورے شعر یا اس کے جزو سے دو معنی پیدا کرتا ہے۔ یعنی شعر میں ایسے ذو معنی لفظ کا استعمال جس کے دو معنی ہوں۔ ایک قریب کے دوسرے بعید کے اور شاعر کی مراد معنی بعید سے ہو، ایہام کہلاتا ہے۔

اردو ادب میں ایہام گوئی کو فروغ کیوں حاصل ہوا۔ اس کے متعدد وجوہات ہیں

۱۔ فارسی کا غلبہ توڑنا: اردو کے ابتدائی دور میں جب اس زبان کا سامنا فارسی سے ہوا تو شعرا نے اردو کا تمول اور قدرتِ بیان ظاہر کرنے کے لیے لفظ کو نئے نئے قرینوں سے باندھنے کی شعوری کوشش کی اور ایہام کا فروغ دیا۔

۲۔ہندی دوہے: محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ اردو میں ایہام کو ہندی دوہوں کی اساس پر فروغ حاصل ہوا اور ہندی میں یہ سنسکرت سے آیا ہے۔ سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں۔ سنسکرت میں اس صنعت کا نام "سلش" ہے۔اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ سبھنگ اور ابھنگ۔ سبھنگ میں لفظ سالم رہتا ہے جب کہ ابھنگ میں لفظ کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے یہ صنعت پیدا کی جاتی ہے۔

۳۔خان آرزو کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ: خان آرزو کو یقین تھا کہ مستقبل میں فارسی کے بجائے ریختہ ہی اس ملک کی زبان بننے والی ہے، چناں چہ اس نے فارسی سے توجہ ہٹا کر اردو کو متمول بنانے پر توجہ صرف کی اور اپنے شاگردوں کو فارسی کے بجائے اردو میں شعر کہنے پر مائل کیا۔ساتھ ہی ساتھ ریختہ کے مشاعروں کا انعقاد کیا جسے "مراختہ" کہا گیا۔اس نے ایک لغت "نوادرالالفاظ" کے نام سے لکھی۔

۴۔دیوانِ ولی دکنی کا نتیجہ: ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک ہر بڑے شاعر کی طرح دیوان ولی میں بھی بہت سے رنگ موجود تھے۔خود ولی کے کلام میں ایہام گوئی کا رنگ موجود ہے۔اگرچہ ولی کے ہاں یہ رنگِ سخن بہت نمایاں نہیں تاہم جس طرح ہر شاعر نے اپنی پسند کے مطابق ولی کی شاعری سے اپنا محبوب رنگ چنا۔اسی طرح آبرو، مضمون، ناجی اور حاتم نے دیوانِ ولی سے ایہام کے رنگ کو چنا۔یوں ہم یہ کہہ سکتے ہیں ایہام کی ایک بڑی وجہ ولی کا کلام بھی تھا۔

۵۔ایہام گوئی کے فروغ میں اس دور کے درباری، سیاسی اور سماجی زندگی کا ہاتھ: ایہام گوئی کے رجحان کا ایک اور اہم سبب محمد شاہی عہد کے درباری اور مجلسی زندگی تھی۔یہ دور برصغیر کا نہایت بحرانی دور رہا۔محمد شاہ گو بادشاہ تو بن گیا تھا لیکن اس میں وہ صلاحیتیں موجود نہ تھیں جو گرتی ہوئی حکومت کو سنبھال سکتیں۔اس نے اپنی ناکامی کو چھپانے کے عیش و عشرت اور رقص و سرور کا سہارا لیا۔طوائفوں اور بھانڈوں کی محفلیں جمنے لگیں۔اس قسم کی مجلسی فضا میں جہاں حسن و عشق کا تصور انفرادی کے بجائے اجتماعی جذبے کی صورت اختیار کرلے تو پھر اس کے اظہار کے لیے ایسے پیرائے کی ضرورت ہوتی ہے جس میں ایہام، رعایت لفظی، ذو معنی اور پہلو دار معنی، ضلع جگت، چٹکلے اور پھبتیاں وغیرہ۔یوں اس دور کے تہذیبی موسم اور معاشرتی زمین ایہام گوئی کے پھلنے پھولنے کے لیے نہایت مناسب تھی۔سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور میں تلواریں کند اور الفاظ تیز ہوگئے تھے۔چناں چہ وہ امور جو صرف قوتِ بازو سے سرانجام پاسکتے تھے، اب زبان کی مدد سے ادا ہونے لگے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تحریک کے اکثر شعرا سپاہی پیشہ تھے۔شیخ شرف الدین مضمون، شاکر ناجی اور شاہ خاتم سپاہی پیشہ تھے۔چناں چہ جب پیشۂ سپاہ گری باعثِ عزت نہ رہا تو سپاہیوں نے اپنے جوہر شاعری کے میدان میں آزمائے اور لفظوں سے پنجہ آزمائی کی۔

۶۔ایہام کے فروغ میں قانونِ تلافی کا بھی خاصا عمل دخل ہے: اس دور کے اکثر شعرا جسمانی خامیوں کے شکار تھے اور یہی چیز ان شعرا کے درمیان وجۂ چشمک کا وسیلہ بھی نظر آتا ہے۔چناں چہ شاہ مبارک آبرو ایک آنکھ سے معذور تھے۔شاکر ناجی آبلہ رو تھے۔مضمون کے دانت نزلے کے سبب جھڑ گئے تھے اور خانِ آرزو از راہ مذاق اسے شاعر بے دانہ کہا کرتے تھے۔ان شعرا کی جسمانی خامی کی تلافی بلاواسطہ طور پر تحریکِ ایہام کے فروغ کا باعث بنی۔

اس تحریک کے قابلِ ذکر شعرا اور نمونۂ کلام حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ولی دکنی: ولی دکنی نے اپنی شاعری میں رعایتِ لفظی سے ایہام کا جلوہ پیدا کیا ہے اور چونکہ وہ پہلے شاعر ہیں جسے ایہام گوئی رواج پاتی ہیں، چناں چہ وہ اپنے معاصر شعرا کے لیے مثال بن گیا۔ایہام میں ولی کا انداز نہ صرف فطری نظر آتا ہے بلکہ اس میں بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے۔

موسیٰ جو آکے دیکھے تجھ نور کا تماشا　　　اس کو پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا

۲۔ شیخ نجم الدین عرف شاہ مبارک آبروؔ (۱۶۸۴ء۔ ۱۷۳۳ء): گوالیار میں پیدا ہوئے۔ آغازِ جوانی میں دہلی آئے اور شاہی ملازمت سے منسلک ہو گئے۔ محمد شاہی عہد میں منصب داری اور دنیاداری ترک کر کے قلندری اختیار کی۔ طبیعت میں شوخی اور ظرافت تھی۔ حسن پرستی اور عاشق مزاجی میں مشہور تھے۔ نمونۂ کلام:

دل اشک کی جلن میں پھپولا ہوا پیا　　　کیوں غیر سیں بلا کے کہا تم نے آب لا

۳۔ محمد شاکر ناجیؔ: محمد شاہی عہد میں نواب امیر خان کی مصاحب میں رہے۔ نادر شاہ کے حملۂ دہلی کے موقع پر موجود تھے۔ آپ نے ان مشاہدات کی روشنی میں ایک مخمس (شہر آشوب) لکھا جس میں ہندوستانی سپہ کی آرام طلبی، نا اتفاقی اور کسمپرسی کی حالت بیان کی ہے۔ آپ کی ایہام گوئی فکری آزمایش سے دوچار نظر آتی ہے اور تخلیقی لطافت نمایاں نہیں ہوتی۔ آپ کا ایہام مصنوعی نظر آتا ہے۔ نمونۂ کلام:

نہ ٹوکو یار کو کہ خط کور کھاتا یا منڈاتا ہے　　　مرے نشے کی خاطر لطف سے سبزی بناتا ہے

۳۔ شرف الدین مضمونؔ: شیخ فرید الدین گنج شکر کی اولاد سے تھے۔ ابتدائے جوانی میں شاہ جہان آباد آگئے اور زینت المساجد میں سکونت اختیار کی اور وہیں پھر ۱۷۳۴ء کو وفات پائی۔ مضمونؔ بھی اس دور کے عام روش کے مطابق ایہام گوئی میں دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن وہ کم گو تھے ان کا دیوان بقولِ میر دردؔ صد بیت اور بقولِ شفیق اورنگ آبادی سہ بیت پر مشتمل ہے۔

ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا　　　صبر ایوب کیا، گریۂ یعقوب کیا

کوئی اس جنس کا دلّی میں خریدار نہیں　　　دل تو حاضر ہے ولیکن کوئی دلدار نہیں

۴۔ مصطفٰی خان یکرنگؔ: دہلوی تھے اور خانِ جہاں لودھی کے پوتے اور شاہی ملازمت کے سلسلے میں منسلک تھے۔ رنگین طبع اور خوش مزاج تھے۔ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ صنعتِ ایہام کے باوصف کلام میں سادگی اور جذبات نگاری پائی جاتی ہے۔

ہاتھ اُٹھا جور اور جفا سے تو　　　یہی گویا سلام ہے تیرا

لبِ شیریں سے تلخ کاموں کو　　　بولنا تلخ کام ہے تیرا

۵۔ محمد سجاد سجادؔ: اکبر آباد میں پیدا ہوئے اور دہلی میں تربیت پائی۔ سجادؔ کو علوم کے حصول میں کمالِ استعداد تھی۔ علم طب، طلسمات و انشا، خوش نویسی و شاعری میں بلند مرتبہ حاصل تھا۔ بادشاہی فرمان نویسی کے سلسلے میں کبھی کبھی دربار معلٰی آتے تھے۔ ایہام گوئی کے باوصف کلام میں پر خلوص جذبات کی گرمی پائی جاتی ہے۔

بتاں تو چاہتے، سجاد تجھ کو　　　کریں پر کیا خدا نے جو نہ چاہا

میں جو اس کی گلی میں جاتا ہوں　　　دل کو کچھ گم ہوا سا پاتا ہوں

۶۔ نواب صدر الدین فائزؔ: نواب علی مردان خان کے بیٹے اور خود بھی شاہی منصب دار تھے۔ ان کی ولادت اور وفات کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ البتہ انہی کلام کی داخلی شہادتوں کی بنا پر اسے عالمگیر کے آخری دور کا شاعر قرار دیا گیا ہے۔ فائزؔ اپنے عہد کے ذی علم آدمی تھے۔ فائزؔ کے مطبوعہ اردو دیوان میں کل بتیس غزلیں ہیں۔ جن میں انیس غزلیں ولیؔ دکنی کے زمینوں میں ہے۔ عام طور پر فائزؔ کو شمالی ہند کا پہلا صاحب دیوان شاعر کہا جاتا ہے۔

جب سجیلے خرام کرتے ہیں ہر طرف قتلِ عام کرتے ہیں
دل لبھاتا ہے سب کا وہ ساجن دل فریبی میں اس کو کیا فن ہے

۷۔ شیخ ظہورالدین حاتم (۱۶۹۹ء۔۱۷۷۲ء): دہلی میں پیدا ہوئے۔ پہلے "رمزی" اور بعد میں "حاتم" تخلص کرنے لگے۔ ابتدائی زمانہ تنگ دستی میں گزرا لیکن ۱۷۳۵ء میں نواب عمدۃ الملک امیر خان کے مصاحب بنے۔ ان کی فرمایش پہ دو نظمیں ایک "وصفِ قہوہ" اور دوسری "وصفِ تمباکو و حقہ" لکھیں۔ اس کے علاوہ ایک طویل مثنوی "بزمِ عشرت" لکھی جس میں محمد شاہ کی مدح اور اس زمانے کے نشاطیہ ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ محمد شاہی دور کے آغاز میں ایہام گوئی کا چرچا تھا یہ بھی اس رجحان سے متاثر ہوئے۔ ۱۷۳۱ء میں ان کا قدیم دیوان مرتب ہو چکا تھا۔ جب ۱۷۴۴ء کے قریب ایہام گوئی ترک کر کے صاف وشستہ شعر کہنے لگے تو دیوان کو نئے سرے سے مرتب کر کے "دیوان زادہ" نام رکھ دیا۔

مثالِ بحر موجیں مارتا ہے لیا ہے جس نے اس جگ کا کنارا
ہے وہ چرخے مچال سر گرداں جس کو حاتم تلاشِ مال ہوا

ایہام گوئی کے نقصانات: (۱) شعر پر تک بندی کا انداز غالب ہو گیا۔ جب شعرا نے ایہام کو التزام سے استعمال کرنے کی شعوری کوشش کی تو شعر پر تک بندی کا انداز غالب ہو گیا اور شاعرانہ جذبہ ایہام کے لفظوں کے ساتھ چمٹ گیا نتیجتاً شاعری نئے ذو معنی الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس کر الہامی کیفیت سے عاری ہو گئی۔

۲۔ بازاری اور مبتذل مضامین شاعری میں داخل ہوئے: ایہام کی وجہ سے شاعر کی توجہ الفاظ کی ذو معنی استعمال پر ہوتی تھی۔ لہٰذا وہ ہر لفظ کو احاطۂ تحریر میں لاتا تھا۔ جس کی وجہ سے میں متبذل اور بازاری مضامین بھی شاعری میں گھس آئے۔

ایہام گوئی کے فوائد: (۱) اس دور کی شاعری بنیادی طور پر اپنے ماحول سے ہم آہنگ اور اجتماعی آسودہ حال شخصیتوں کی شاعری ہے۔ اس میں داخلی گھٹن، تلخی، یاس اور زندگی سے بیزاری کے میلانات بہت کم ہیں۔ یہ شاعری اپنے عہد کی نشاطیہ مجلسی روح کی ترجمان ہے۔ اس میں مجازی حسن و عشق کی باتیں ہیں۔ ولیؔ کی شاعری میں صوفیانہ جمال پرستی کا سیدھا سادہ اظہار ملتا ہے۔ اس دور کے ایہام گو شعرا نے حسن و جمال کے اس رجحان میں اپنے تہذیبی عناصر اور حسن و لطافت کو سمو کر انفرادیت پیدا کی۔

(۲) خارجی اور تمدنی زندگی کی آئینہ دار: ایہام گوئی کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ ایہام کی صنعت کے التزام میں شعرا نے خارجی زندگی کے حوالے سے بہت سے معاشرتی اور مجلسی کوائف بیان کر دیے ہیں جس کی روشنی میں ہم اس دور کی تمدنی زندگی کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

۳۔ لسانی اہمیت: لسانی اعتبار سے یہ دور خاص اہمیت کا حامل ہے۔ شمالی ہند میں فارسی کی بجائے اردو کو پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ تخلیقی مقاصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا تھا۔ قدرتی طور پر اس دور میں فنکاروں کو اپنی زبان کی وسیع دامنی کا احساس ہوا اور انھوں نے صنعت گری کے شوق میں زبان کے ذخیرۂ الفاظ کو کھنگالنا شروع کیا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اردو کی لغت نویسی بھی اسی دور میں شروع ہوئی۔ "غرائب اللغات" (عبد الواسع ہانسوی) اور "نوادرالالفاظ" (خانِ آرزو) اسی زمانے میں لکھی گئی۔

اصلاحِ زبان کی تحریک

شعر و ادب میں دو رجحانات کے مابین کوئی زمانی حدِ فاضل قائم کرنا مشکل ہے تاہم بعض حالات رجحانات کی تبدیلی کو متعین کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ ایہام گوئی کی تحریک محمد شاہی عہد ۱۷۱۹ء کو شروع ہوئی تھی۔ دراصل یہ تحریک اس معاشرے کی خوشحالی اور فارغ البالی کی عکاس تھی لیکن جب ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ درانی نے دہلی پر حملہ کیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو حساس ذہنوں پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے اس کے نتیجے میں اردو شاعری میں ایہام گوئی کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا۔ چناں چہ شاہ حاتمؔ نے اپنے قدیم دیوان "دیوان زادہ" کا انتخاب اس اعلان کے ساتھ کیا۔

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بسکہ بے تلاش   حاتمؔ کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ

شاہ حاتمؔ نے اپنے قدیم دیوان سے بعض اشعار نکال دیے اور بعض میں اصلاحیں کیں۔ ان اصلاحوں کے پیشِ نظر انھوں نے "دیوان زادہ" کا مختصر دیباچہ بھی لکھا جس میں انھوں نے اصلاحِ زبان کے سلسلے میں اپنے خیالات پیش کیے جو تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایہام گوئی اور اس سے قبل ریختے میں فارسی کے فعل و حرکت استعمال کیے جاتے تھے۔ آپ نے ان کے خلاف آواز اٹھائی۔ دہلی کی روزمرہ، محاورہ اور عربی اور فارسی کے قریب الفہم اور کثیر الاستعمال الفاظ کو قبول کرنے کی تاکید کی۔ انھوں نے دہلی کی قرب و جوار کی ہندی زبان (جسے بھاکھا یا بھاشا کہتے تھے۔) کو ترک کیا اور فقط اس روزمرے کو اختیار کیا جو عام فہم اور خاص پسند تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے چند مثالیں بھی دی ہیں۔

بعض عربی و فارسی الفاظ عام طور پر اس طرح بولے جاتے تھے۔ تسبیح کو تسبی، صحیح کو صحی، بیگانہ کو بگانہ، دیوانہ کو دوانہ یا متحرک حروف کو ساکن اور ساکن حروف کو متحرک بولتے تھے، کی اصلاح کی۔ ہندی الفاظ نین، مکھ، درپن، سنسار وغیرہ کے بجائے "چشم، منہ، آئینہ، دنیا، یا "سوں، ستی اور سیتی" کے بجائے "سے" اور "اودھر کو ادھر"، کیدھر کو کدھر" لکھا اس کے علاوہ "پہ" کی جگہ "پر" اور "تجھ" کی جگہ "تیری" وغیرہ لکھنے کی تاکید کی۔

اصلاحِ زبان کی تحریک میں مرزا مظہر جانِ جاناں کو اولیت حاصل ہے ان کی عطا یہ ہے کہ انھون نے اپنے شاگردوں انعام اللہ خاں یقینؔ، میر باقر حسینؔ، ہیبت قلی خاں حسرتؔ کو نئی زبان میں شعر کہنے پر آمادہ کیا۔

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار   ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت میں جاتی ہے بہار

خواجہ میر دردؔ نے اصلاحِ زبان کی تحریک کو تصوف کے آئینے میں دیکھا ان کے ہاں لفظوں کے انتخاب میں شعوری کاوش نظر نہیں آتی بلکہ زیر لبی کی کیفیت نے زبان کو دردمندی، روانی اور نغمگی عطا کر دی ہے۔

دردؔ کی سادگی اور پرکاری کے برعکس سوداؔ اختراع اور صعنت کاری کا زاویہ ہے چناں چہ انھوں نے اردو شاعری میں ان گنت نئے تراکیب استعمال کر کے اسے ایک طلسم خانہ بنادیا۔ سوداؔ نے گوشۂ ابرو، سرِ زخمِ دل، بلاکشانِ محبت وغیرہ جیسے نئے تراکیب اردو زبان کو دیے۔ سوداؔ نے اپنے زمانے میں فارسی زبان کو اردو کے خمیر میں اس طرح شامل کیا کہ بعض اوقات اردو کا اپنا روپ بھی پہچاننا مشکل ہو گیا۔

میرؔ نے جلالی زبان استعمال کرنے کے بجائے سجل، کومل، لطیف اور موسیقی آمیز زبان استعمال کی اور مفرد الفاظ کے پیوند سے نئے تراکیب تراشے جیسے: صحرا صحرا وحشت، جہاں در جہاں غفلت، سخنِ مشتاق، خاک افتادہ۔ وغیرہ۔ میرؔ کی زبان نے اردو گرامر کو بھی متاثر کیا۔ چناں چہ انھوں نے سیر، جراحت، جان، سطح اور خلش کو مذکر اور خواب، گلزار حشر، مزار کو مؤنث باندھا۔ ندا کی حالت میں الفاظ کی جمع فارسی طریق کے مطابق استعمال

کی۔ چناں چہ بتاں، ہم صغیراں، آوار گاں بہت سے الفاظ میرؔ کے خاص رنگ کے غماز ہیں۔افعال و صفات کی بھی جمع بنائی گئی۔بے وفائیاں، کج ادائیاں۔وغیرہ

میر حسنؔ کی زبان پاکیزگی اور شائستگی کی مثال ہے انھوں نے روزمرہ کی مجلسی لہجے کو زبان کے ادبی لہجے سے ہم آہنگ کر دیا۔لسانی اعتبار سے ناسخؔ کی تحریک اردو زبان کے لکھنوی انداز کو پیش کرتی ہے اس میں تکلف، آرایش اور آورد کا پہلو نمایاں ہے۔چناں چہ انھوں نے لفظ کو ہیرے کی طرح تراش کر نگینے کی طرح بٹھانے کی کوشش کی اور اس پر داد صرف حسنِ بیان اور حسنِ زبان کے زاویے سے حاصل کی۔

ناسخؔ نے اردو زبان میں جن تبدیلیوں کو رواج دیا، ان میں سب سے اہم فارسی اور عربی الفاظ کا استعمال ہے انھوں نے نپٹ، لاگا، کھوج، ماٹی، پالا، سجن، تک، دارو، کنے، پگاہ کا نالہ، چھبے ہے، لگن لگادی وغیرہ کی جگہ بہت، لگا، نشان، مٹی، پیالہ، صنم، ذرا، دوا، کس نے، نالۂ سحر، چبھتا ہے اور محبت لگادی کو استعمال کرنے کی تاکید کی۔ناسخ نے حشو وزوائد کے استعمال پر کڑی پابندی لگائی، تنافر، غرابت اور تعقید سے بچنے کی تلقین کی اور بندش کے طرزِ فارسی کو فروغ دیا۔ناسخ نے اردو کی صرف و نحو کو درست کیا۔روزمرہ اور محاورہ کی چھان پھٹک کی اور اس کے قاعدے مقرر کیے۔ تمام مستعمل الفاظ کی تذکیر و تانیث کے اصول تراشے۔ افعال اور مصادر میں اہم تبدیلیاں کیں۔ عروض و قافیہ کے لحاظ سے وزن اور شعر کی درستی پر زور دیا۔ الغرض ناسخؔ نے ریختہ کو اردو زبان کا نام دیا۔چناں چہ پہلے غزل کو بھی ریختہ کہا جاتا تھا لیکن ناسخؔ نے صنفِ غزل کے لیے ریختہ کا لفظ متروک کر دیا۔

دبستان دہلی

اورنگزیب عالمگیر کا انچاس سالہ دورِ حکومت برصغیر پاک وہند میں مسلم اقتدار کا نقطہ عروج تھا۔تقریباً پورا برصغیر مغلیہ پرچم کے زیرِ نگین آگیا تھا۔اورنگزیب کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمد معظم شاہ عالم بہادر کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہوا۔اس نے تخت کے حصول کے لیے سرائے جاجو کے میدان میں اپنے بھائی محمد اعظم کو قتل کیا۔اس کے بعد اپنے دوسرے بھائی کام بخش کو دکن میں قتل کر کے اکیلے تخت کا وارث بنا۔۱۷۱۲ء کو محمد معظم کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں تختِ سلطنت کے لیے لڑائی شروع ہو گئی۔آخر جہاندار شاہ نے دوسرے بھائیوں کو شکست دی اور دہلی کے تخت پر جا بیٹھا۔وہ ایک عیاش پسند انسان تھا۔اس کے ایک سالہ دورِ حکومت میں طوائفوں، ڈوموں اور میراثیوں کو غیر معمولی عروج حاصل ہوا۔وہ ایک طوائف لال کنور پر فدا تھا اور اس کی ہر خواہش پوری کر دیتا تھا۔

جہاندار شاہ کو اس کے بھتیجے فرخ سیر نے ساداتِ بارہہ (سید عبداللہ، سید حسین علی) کی مدد سے فروری ۱۷۱۳ء میں شکست دی، قتل کیا اور خود تخت پر قابض ہو گیا۔مگر عملی اقتدار سید برادران کے ہاتھ میں تھا۔جب فرخ سیر نے ساداتِ بارہہ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی تو اسے اندھا کر کے اپریل ۱۷۱۹ء کو مروا دیا گیا۔اب ساداتِ بارہہ نے اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے جسے مناسب سمجھا تخت پر بٹھایا اور جب چاہا اسے تخت سے اتار دیتا۔۔چناں چہ چھ ماہ کے عرصے میں انھوں نے تین بادشاہوں؛ رفیع الدرجات، رفیع الدولہ اور روشن اختر کو تخت نشین کیا۔موخر الذکر نے محمد شاہ کے نام سے انیتس (۲۹) سال (۱۷۱۹ء۔۱۷۴۸ء) حکومت کی۔محمد شاہ بھی طبعی طور پر عیش و عشرت کے طرف مائل تھا اور اسی وجہ سے " رنگیلا پیا" کے نام سے مشہور ہوا۔

محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا۔اس کے دور میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔سلطنت کے شمالی حصے ابدالی کے تصرف میں چلے گئے اور مرکز میں وزراء (غازی الدین خاں عمادالملک اور صفدر جنگ) کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوئی۔عمادالملک نے احمد شاہ کو معزول کر کے بہادر شاہ اول کے ایک پوتے کو عالمگیر ثانی کا لقب دے کر ۱۷۵۴ء کو تخت پر بٹھایا۔عمادالملک نے ۱۷۵۹ء کو عالمگیر ثانی کو قتل کروا

کر اس کی جگہ ایک اور کٹھ پتلی شہزادے کو شاہ جہان ثالث کا لقب دے کر تخت نشین کر دیا۔ ابدالی ۱۷۶۰ء کو دہلی پہنچا اور شاہ جہان ثالث کو معزول کر کے اس کی جگہ جواں بخت کو تخت پر بٹھا دیا لیکن ابدالی کے دہلی سے روانہ ہوتے ہی مرہٹوں اور جاٹوں نے پھر دہلی کو روند ڈالا۔ جنوری ۱۷۶۱ء کو احمد شاہ ابدالی نے روہیلہ سردار نجیب الدولہ اور اودھ کے نواب وزیر شجاع الدولہ کی مدد سے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دی اور جواں بخت کی جگہ عالی گہر (شاہ عالم ثانی) کو ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اسی اثنا میں انگریزوں نے ۱۸۰۳ء کو علی گڑھ، دہلی اور آگرہ کو فتح کیا اور شاہ عالم ثانی کو تخت پر بٹھا دیا مگر اب اس کی حیثیت ایک پنشنیر کی تھی اور لال قلعے کے سوا اس کے اختیار میں ایک گاؤں تک بھی نہ تھا۔ یہ ایک ایسا پر آشوب دور تھا جس میں ہر طرف بد نظمی، انتشار اور پستی کا دور دورہ تھا۔ ملک میں ہر طرف بے چینی تھی۔ ان حالات کے تحت جس قسم کی شاعری پروان چڑھی۔ تاریخ میں اسے دبستانِ دہلی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

شعراء

میر تقی میر: (۱۷۲۲ء۔۱۸۱۰ء)

میر تقی میر کی شاعری کا اہم بنیادی عنصر غم ہے۔ خود میر نے اپنی شاعر کے بارے میں کہا ہے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کے صاحب میں نے　　درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میر کا غم آفاقی نوعیت کا ہے جس میں غم عشق سے لے کر غم دنیا کا احوال موجود ہے۔ انہوں نے جو کچھ محسوس کیا بڑی صداقت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ ان کی شاعری اپنے تجربات اور احساسات کا صحیح اور سچا اظہار ہے۔ ان کے اشعار جو بھی پڑھتا ہے اس کے دل میں اتر جاتے ہیں۔

ابتداء ہی میں مر گئے سب یار　　عشق کی کون انتہا لایا

میر کی شاعری ہندی اور ایرانی تہذیب کی آمیزش کی بہترین مثال ہے۔ ان کے ہاں فارسی تراکیب کے ساتھ ساتھ ہندی کا ترنم اور موسیقیت بھی ملتی ہے۔

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے　　جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

میرزا محمد رفیع سودا: (۱۷۰۶ء۔۱۷۸۱ء)

سودا، میر کے ہم عصر تھے۔ ان کا شمار اردو زبان کے اہم شعراء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مخمس، ہجو، رعبایاں، قطعے، ترجیع بند، واسوخت، سلام، مرثیے غرض یہ کہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن ان کی شہرت بحیثیت قصیدہ گو اور ہجو گو کے زیادہ ہے۔ ان کی غزلوں کی تعداد نسبتاً کم ہے لیکن غزل میں ان کے مقام اور مرتبہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بقول خلیق انجم:

> "سودا کے ہاں زور بیان، معنی آفرینی، خیال بندی، پرواز تخیل، جدت بیان، قدرتِ اظہار، نشاط انگیزی اور جوش و خروش ملتا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔"

لیکن یہ بات یاد رہے کہ سودا کی غزلوں میں خلوص اور جذبات کی سادگی، بے ساختگی اور وہ درد و سوز نہیں ہے جو میر کی غزل کا طرہ امتیاز ہے۔

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے　　یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا　　ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

سودا جو تیرا حال ہے اتنا تو نہیں وہ　　کیا جانیے تو اسے کس حال میں دیکھا

خواجہ میر درد: (۱۷۲۰ء۔۱۷۸۵ء)

میر درد ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ تھے اور ایک صوفی باپ کے بیٹے تھے۔ انہوں نے تصوف کو صرف روایت سے مجبور ہو کر نہیں اپنایا بلکہ وہ خود ایک با عمل صوفی تھے۔ ان کے مزاج میں اعتدال، توازن، حلم، تحمل اور بردباری کی صفات موجود تھیں۔ اس لیے جہاں جاتے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ قناعت اور خودداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی انہی صفات کا عکس ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ بقول عظمت اللہ:

خواجہ میر درد اردو ادبیات میں صوفیانہ شاعری کے باوا آدم تھے"

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا — تو ہی آیا نظر، جدھر دیکھا

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

اس ہستی خراب سے کیا کام تھا ہمیں — اے نشہ ظہور یہ تری ترنگ تھی

ابراہیم ذوق: (۱۷۸۹ء۔۱۸۵۴ء)

ذوق کو بعض نقادوں نے سودا کے مشابہ قرار دیا ہے ایک تو اس لیے کہ ہجو گوئی کے باوجود دونوں کا کوئی مخصوص طرز احساس نہیں اور دوسرے دونوں نے قصیدہ کو بھی پایہ کمال تک پہنچایا۔ ان کی غزل میں جذبے کا فقدان نظر آتا ہے اس لیے کہ انہوں نے محض الفاظ کے ذریعے شاعری کی۔ انہوں نے فکر اور جذبہ کی کمی کو محاورات کے ذریعے پوری کرنے کی کوشش کی۔ بعض اشعار کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ صرف محاورہ بندی کے لیے لکھے گئے ہیں۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کی واردات بھی ہیں اور تصوف اور اخلاقی پند بھی لیکن یہ سب روایتی محسوس ہوتے ہیں۔

وقتِ پیری شباب کی باتیں — ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

مرزا اسد اللہ خان غالب: ۔۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء)

غالب کی شاعری ہر دور میں نہ صرف زندہ رہی بلکہ جدید بھی رہی۔ ان کے ہاں ہمیں جنس کا ایک صحت مندانہ رویہ ملتا ہے۔ انھیں مسلسل پریشانیوں اور محرومیوں نے نہ صرف زندگی سے پیار کرنا سکھایا۔ بلکہ انہوں نے غم کو ایک حقیقت کے روپ میں قبول کیا۔ ان کے نزدیک غم کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد اس کی تلخی اور چبھن میں کافی کمی ہو جاتی ہے۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے — بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

غالب کی شاعری اس کے فلسفیانہ اور جدید ذہن کی غمازی کرتا ہے۔ جو کہ نئی تہذیب اور پرانی تہذیب کی آویزش اور کشمکش سے وجود میں آئی ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مومن خان مومن: (۱۸۰۳ء۔۱۸۵۴ء)

مومن تمام عمر غزل کے پابند رہے اور غزل میں کم سے کم الفاظ میں بڑے سے بڑے خیال، ابلاغ اور شدید سے شدید جذبہ کی عکاسی کی کوشش کی۔ اسی لیے جذبہ عشق سے وابستہ تہ در تہ کیفیات کے اظہار میں کمال پیدا کیا۔ چنانچہ انہوں نے دہلی کی خالص اردو میں صاف ستھری غزل تخلیق کی۔ لکھنوی شعراء کے برعکس انہوں نے جنس نگاری کو فحش اور ابتذال سے بچا کر صحت مند حدود میں رہنے دیا۔ ان کی معاملہ بندی لکھنوی شعراء سے یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں ایک جدید تصور عشق ملتا ہے۔ مومن کا عاشق واضح طور پر ہرجائی ہے۔

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

نقادوں نے ان کی شاعری کی اہم خصوصیت نکتہ آفرینی کو بھی قرار دیا ہے۔

تا نہ خلل پڑے کہیں آپ کے خواب ناز میں　　ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن　　آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

سیاسی اور معاشرتی حالات کی بدولت دبستانِ دلی میں جس رنگ شاعری کا رواج ہوا اس کی خصوصیات درج ذیل ہیں۔

خصوصیات

زبان میں فارسیت:۔

دبستان دہلی کے شعراء کے ہاں فارسیت کا بہت غلبہ تھا کیونکہ شعرائے دہلی فارسی کی شعری روایت سے متاثر تھے اور ان پر فارسی شعراء کا گہرا اثر تھا۔ ایران سے جو شعراء آتے تھے ان میں سے اکثر یہاں ہی رہ جاتے تھے۔ چنانچہ، خسرو، حسن، عرفی، نظیری، طالب، صائب اور بیدل وغیرہ مختلف ادوار میں یہاں رہے۔ اس کے علاوہ یہاں فارسی شعراء کی زبان تھی۔ نیز یہاں کے شعراء اردو اور فارسی زبانوں میں دسترس رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی اسالیب و موضوعات وغیرہ دہلی کے دبستان شاعری میں شامل ہو گئے۔ اس طرح بہت سے شعراء نے فارسی شعراء سعدی، وحافظ کا ترجمہ کیا۔ اور خزانہ اردو کو مالا مال کیا۔ اس طرح دبستان دہلی کی شاعری میں فارسیت کا غلبہ ہے۔

جذبات عشق کا اظہار:۔

دبستان دہلی کے شعراء کے ہاں جذبات و احساسات کے اظہار پر زیادہ زور ہے۔ دبستان دہلی کے شعراء نے عشق کے جذبے کو اولیت دی۔ بقول ڈاکٹر نور الحسن شعرائے دہلی کو اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ان کا اسلوب بیان اور طرز ادا خوب تر ہو بلکہ ان کی کوشش تھی کہ شاعری میں جذبات و احساس کا اظہار ہو جائے۔ اس لئے بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا شاعر کو عشق سے عشق ہو گیا ہے۔ دہلی کے کچھ شعراء عشق مجازی سے گزر کر عشق حقیقی سے سرشار ہوئے۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے لو لگائی اور فیضان عشق کی بدولت ان میں ایسی بصیرت پیدا ہوئی کہ وہ تمام بنی نوع انسان سے محبت کرنے لگے۔ جبکہ کچھ لوگ عشق مجازی کی منزل پر رک گئے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں محبت کا سوز اور تڑپ موجود ہے۔ جبکہ کچھ لوگ نفس پر قابو نہ پاسکے اور وہ ابولہوسی میں مبتلا ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ دہلی میں عشق کے یہ تینوں مدارج موجود ہیں۔ مثلاً درد جیسے شاعروں نے صوفی شاعری کی اور عشق حقیقی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے　　اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

جب وہ جمال دل افروز صورتِ مہر نیم روز　　آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

عشق مجازی:۔

عشق کا دوسرا انداز جو دہلی میں بہت مقبول ہوا اس میں عشق حقیقی کے ساتھ ساتھ عشق مجازی کے جذبات بھی شامل ہو گئے۔ یہ رنگ میر تقی میر نے بہت خوبی سے نبھایا۔ ان کے جذبہ عشق میں وہ خلوص اور گہرائی تھی جس نے ان کی شاعری کو حیات جاوداں عطا کی۔ عشق کا یہ تیکھا انداز دبستان دہلی سے مخصوص ہے۔ عشق مجازی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ جن میں دہلی کے تمام شعراءنے بڑی خوبصورتی سے ان جذبات کو شاعری کا روپ دیا ہے۔

پاس ناموسِ عشق تھا ورنہ — کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے — یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

لوگ کہتے ہیں عاشقی جس کو — میں جو دیکھا بڑی مصیبت ہے

پھر کے جو وہ شوخ نظر کر گیا — تیرے کچھ دل میں گزر کر گیا

حزن و یاس:۔

دبستان دہلی کی شاعری کی ایک اور نمایاں خصوصیت رنج والم اور حزن و یاس کا بیان ہے۔ دبستان دہلی کی شاعری کا اگر بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ دبستان دہلی کی شاعری میں یاس و ناامیدی کے جذبات بکثرت موجود ہیں۔ شاعر خواہ کسی موضوع پر بات کرے رنج والم کا ذکر ضرور آجاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس سارے دور میں کسی کو اطمینان و سکون نصیب نہ تھا۔ زندگی ایک خواب پریشاں بن کر رہ گئی تھی۔ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا۔ کسی شے کو ثبات نہ تھا۔ ان حالات کا شاعری پر بھی گہرا عکس نظر آتا ہے۔ خارج میں تباہی و بربادی پھیلی ہوئی تھی اور تباہی و بربادی کے تاریک سائے شاعری میں بھی راہ پاتے ہیں۔ چنانچہ فنا کا احساس بہت تیز ہے۔ اس کے ساتھ اجڑے ہوئے شہر، لٹے ہوئے نگر اور ویران گزر گاہیں جا بجا موجود ہیں۔ خصوصاً میر و سودا کے دور میں زندگی کی ناپائیداری کا احساس بہت شدت سے اظہار کی راہ پاتا ہے۔ چنانچہ حزن و یاس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور — یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن — جب آنکھ گل کی کھلی تو موسم تھا خزاں کا

دل گنوانا تھا اس طرح قائم — کیا کیا تو نے ہائے خانہ خراب

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

اس حزن و یاس کی فضاء کے بارے میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ

"ظاہر ہے دہلی کی شاعری یک سر جذبات کی زبان و گفتگو ہے اور جذبات بھی وہی ہیں جن کا تعلق زیادہ تر حرماں و مجبوری و ناکامی سے ہے۔"

تصوف:۔

واردات قلبی کے اظہار کے بعد دبستان دہلی کے شعراء کا دوسرا محبوب ترین موضوع تصوف ہے۔ چونکہ ابتداء میں اردو شاعری پر فارسی شاعری کی شعری روایت کا بہت زیادہ غلبہ رہا ہے جس کی وجہ سے اردو شعراءنے غیر شعوری طور پر فارسی شاعری کے اسالیب، سانچے، اور موضوعات قبول کر لئے۔ دوسری طرف اس موضوع کو اس لئے بھی مقبولیت ملی کہ کہ تصوف میں بھی قناعت، صبر و توکل اور نفی ذات کے نظریات نے زیادہ

زور پکڑا کیونکہ اس زمانے کے حالات ہی ایسے تھے جن کی بناء پر لوگ ترک دنیا کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ اس زمانے میں یہ خیال عام تھا کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است ان میں کچھ تو صوفی شعراء تھے لیکن زیادہ تر شعراء نے محض رسمی طور پر تصوف کے مضامین کو نظم کیا۔ چنانچہ ذوق اور غالب کے زمانے تک تقریباً ہر شاعر کے کلام میں تصوف کے مضامین نظر آتے ہیں۔ تصوف کی مقبولیت کا دوسرا سبب یہ تصورات و اقدار تھے جو ہندوستان کی فضاء میں رچے بسے ہوئے تھے۔ جن کی بدولت انہوں نے تصوف کو موضوع بنایا۔

مسافر اٹھ تجھے چلنا ہے جانب منزل — بجے ہیں کوچ کا ہر دم نقارہ

غافل قدم کو اپنے رکھیو سنبھال کریاں — ہر سنگ راہ گزر کا دکاں شیشہ گر کا ہے

ہے جلوہ گاہ تیرا، کیا غیب کیا شہادت — یاں بھی شہود تیرا، واں بھی شہود تیرا

اس ہستی خراب سے کیا کام تھا ہمیں — اے نشہ ظہور یہ تیری ترنگ تھی

سرسری تم جہاں سے گزرے — ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

اس قدر سادہ و پرکار کہیں دیکھا ہے — بے خود اتنا نمودار کہیں دیکھا ہے

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

راز پوشیدہ پوچھے کس سے — بے خبر ہے، جو باخبر ہے

رمزیت اور اشاریت:۔

تصوف کی بدولت اردو شاعری میں بڑی وسعت پیدا ہوئی چنانچہ بقول ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی،

> ”دہلی میں تصوف کی تعلیم اور درویشی کی روایت نے خیالات میں بلندی اور گہرائی پیدا کی اور اسلوب میں متانت و سنجیدگی کو برقرار رکھا۔ تصوف کے روایات نے شاعری کو ایک اخلاقی لب و لہجہ دیا اور ابتذال سے دور رکھا۔“

مسائل تصوف نے اردو غزل کو رمز و کنایہ کی زبان دی، پیر مغاں، گل، بلبل، چمن، شمع، پروانہ، میکدہ، اسی طرح کی اور بہت سی علامتیں تصوف کے راستے اردو شاعری میں داخل ہوئیں۔ تصوف نے اردو شاعری کو فکری پہلو بھی دیا اور استغنا کا درس دے کر درباداری سے الگ رکھا۔ مزاجوں میں خوداری اور بے نیازی پیدا کی۔ تصوف کی بدولت اردو شاعری میں جو رمزیت اور اشاریت آئی اس سے شعراء نے بہت فائدہ اٹھایا اور چند لفظوں میں معنی کی دنیائیں آباد کیں۔ ذیل کے اشعار دیکھئے کہ پردوں میں کتنے جہاں آباد دکھائی دیتے ہیں۔

ساقی ہے اک تبسم گل، فرصت بہار — ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے کو گہر ہونے تک

وہ بادہ وشبانہ کی سرمستیاں کہاں — اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

داخلیت:

دبستان دہلی کی شاعری کا ایک اور نمایاں پہلو داخلیت ہے۔ داخلیت سے مراد یہ ہے کہ شاعر باہر کی دنیا سے غرض نہیں رکھتا بلکہ وہ اپنے دل کی واردات کا اظہار کرتا ہے۔ اگر باہر کی دنیا کے متعلق کچھ کہتا ہے تو اُسے بھی شدید داخلیت میں ڈبو کر پیش کرتا ہے۔ یہ داخلیت دہلی کے ہر شاعر کے یہاں ملتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیں کہ شعرائے دہلی کے ہاں خارجیت بالکل نہیں ہے۔ خارجیت بھی ہے۔ لیکن داخلیت میں واردات قلبی یعنی عشق و محبت کے مضامین اور ان مصائب کا بیان شعرائے دہلی نے نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

پاس ناموس عشق تھا ورنہ — کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا — درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

واقعیت و صداقت:

دبستان دہلی کی ایک خصوصیت واقعیت و صداقت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان شعراء کے ہاں مبالغہ وغیرہ کم ہے۔ ان شعراء نے مبالغہ سے زیادہ کام نہیں لیا اگرچہ مبالغہ کا استعمال شاعری میں برا نہیں ہے لیکن جس بھی کسی چیز کا استعمال حد سے تجاوز کر جائے تو پھر اُسے مناسب و موزوں نہیں سمجھا جاتا۔ اسی طرح حد سے زیادہ مبالغہ شاعری کو مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ شعراء دہلی کے ہاں اعتدال پایا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ صداقت کے اظہار کے لئے پر تکلف زبان کو بھی موزوں سمجھا جاتا ہے۔

ہر گھڑی کان میں وہ کہتا ہے — کوئی اس بات سے آگاہ نہ ہو

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر — مذہب عشق اختیار کیا

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

تم میرے پاس ہوتے گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سادگی:

شعرائے دہلی کے ہاں زبان میں بھی سادگی، صفائی اور شستگی پائی جاتی ہے۔ شعرائے دہلی نے جس طرح مضامین میں واقعیت و صداقت کو مد نظر رکھا ہے۔ اسی طرح زبان بھی سادہ اور عام فہم استعمال کی ہے۔ اگرچہ ان شعراء نے صنعتوں کا استعمال کیا ہے لیکن وہ صنعت برائے صنعت کے لئے نہیں ہے۔ اس کے بجائے ان شعراء نے معنوی حسن کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تشبیہ اور استعارے کا استعمال حد سے آگے نہیں بڑھتا۔

میر اُن نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے — آن میں کچھ ہے آن میں کچھ

اختصار:

شعرائے دہلی کے کلام میں جہاں زبان میں سلاست و روانی کا عنصر نمایاں ہے وہاں اختصار بھی ہے۔ اس دور میں دوسری اصناف کے مقابلے میں غزل سب سے زیادہ نمایاں رہی ہے۔ اور غزل کی شاعری اختصار کی متقاضی ہوتی ہے۔ اس میں نظم کی طرح تفصیل نہیں ہوتی بلکہ بات اشاروں کنایوں میں کی جاتی ہے۔ اس لئے ان شعراء کے ہاں اختصار ملتا ہے۔ نیز غزل کا مخصوص ایمائی رنگ بھی موجود ہے۔ یہاں کے شعراء اپنے دلی جذبات واحساسات کو جوں کا توں بڑی فنکاری سے پردے ہی پردے میں پیش کر دیتے ہیں۔ اسی بات کا ذکر کرتے ہوئے محمد حسن آزاد لکھتے ہیں کہ:

ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے خیالات دل پر گزرتے ہیں وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ اس واسطے اشعار صاف اور بے تکلف ہیں۔

ہم نشیں ذکر یار کر کچھ آج	اس حکایت سے جی بہلتا ہے
شائد اسی کا نام محبت ہے شیفتہ	اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
دل مجھے اس گلی میں لے جا کر	اور بھی خاک میں ملالایا
بے وفائی پہ اس کی دل مت جا	ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں
تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے	ہم تو کل خوابِ عدم میں شب ہجراں ہوں گے
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے	بے نیازی تیری عادت ہی سہی

مجموعی جائزہ:۔

دہلویت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی لکھے ہیں کہ

دہلویت کا ایک خاص افتاد ذہنی یا مزاج شعری کا نام نہیں ہے جس کا اظہار مخصوص تمدن و شہری اثرات کی وجہ سے ہوا۔ دہلی کا شاعر غمِ روزگار کا ستایا ہوا غم عشق کا مارا ہوا ہے۔ اسی لئے اس کے کلام میں دونوں کی کسک اور کھٹک پائی جاتی ہے۔ سیاسی حالات نے اسے قنوطی بنایا، تصوف نے اس میں روحانیت پیدا کی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک اخلاقی نصب العین اور تصور عطا کیا۔ اسی نے اس کی آنکھیں اندر کی طرف کھولیں۔

دبستان لکھنو

لکھنویت سے مراد شعر و ادب میں وہ رنگ ہے جو لکھنو کے شعرائے متقدمین نے اختیار کیا۔ اور اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر وہ رنگ قدیم اردو شاعری اور دہلوی شاعری سے مختلف ہے۔ جب لکھنو مرجع اہل دانش و حکمت بنا تو اس سے پہلے علم و ادب کے دو بڑے مرکز شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اور وہ دکن اور دہلی تھے۔ لیکن جب دہلی کا سہاگ لٹا۔ دہلی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا تو دہلی کے اہل علم فضل نے دہلی کی گلیوں کو چھوڑنا شروع کیا جس کی وجہ سے فیض آباد اور لکھنو میں علم و ادب کی محفلوں نے فروغ پایا۔

پس منظر:

یہ دیکھنے کے لیے کہ دہلی کے بعد لکھنؤ کس طرح اور کن حالات میں ادبی مرکز بنا، برصغیر کی سیاسی تاریخ کا اجمالی تذکرہ ناگزیر ہے۔ مغلیہ سلطنت میں تخت نشینی کا کوئی باقاعدہ اصول نہ تھا، چناں چہ اورنگزیب عالمگیر کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد تخت نشینی کی لڑائیوں کے مشکل مرحلے سے گزرنے کے بعد شہزادہ محمد معظم بہادر شاہ اول کے لقب سے تخت نشین ہوا لیکن صرف پانچ سال بعد ۱۷۱۲ء میں اسے پیغام اجل آپہنچا۔ ملک ایک بار پھر تخت نشینی کی جنگ کے لپیٹ میں آگیا۔ امیر الامراء ذولفقار خان کی مدد سے جہاندار شاہ کامیاب ہو کر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ لیکن جلد ہی ۱۷۱۳ء

میں چل بسا، اس کے بعد سعاداتِ بارہہ کی مدد سے فرخ سیر تخت حکومت پر بیٹھا، جب فرخ سیر نے ساداتِ بارہہ سے نجات حاصل کرنا چاہی تو انھوں نے پہلے تو بادشاہ کو قید کر دیا اور پھر ۱۷۱۹ء کو قتل کر دیا۔ فرخ سیر کے بعد سید برادران نے سات ماہ کے مختصر عرصے میں دو بادشاہوں رفیع الدولہ اور رفیع الدرجات کو آزمایا اور آخر کار شہزادہ روشن اختر کو محمد شاہ بنا کر تخت نشین کر دیا۔ جس نے امراء کی مدد سے بادشاہ گر سیدوں سے نجات حاصل کی۔

جن امراء نے محمد شاہ کی مدد کی ان میں محمد امین الدین نیشاپوری بھی شامل تھے۔ اس مدد کے صلے میں محمد شاہ نے انہیں سعادت خاں بہادر کے خطاب کے ساتھ پنج ہزاری کا منصب عطا کیا اور ۱۷۲۰ء کو اکبر آباد کا صوبہ دار بنایا گیا۔ ۹ ستمبر ۱۷۲۲ء کو انہیں اودھ کی صوبے داری عطا ہوئی تو محمد امین الدین نیشاپوری نے دریائے گھاگھرا کے کنارے اپنے دورالحکومت کا انتخاب کیا جو بعد میں فیض آباد کہلایا۔ ان کے وفات کے بعد ان کے داماد ابوالمنصور صفدر جنگ ۱۷۳۹ء میں اودھ کے نواب بنائے گئے۔ صفدر جنگ کے بعد شجاع الدولہ ۱۷۵۳ء میں نواب بنے۔ شجاع الدولہ نے کوشش کی کہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو کم کیا جائے لیکن کامیاب نہ ہوسکے تو ان کی دلچسپیوں کا مرکز رزم گاہ کی بجائے بزم گاہ کی طرف موڑ گیا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد کی رونق بہت بڑھ گئی اور بہت سے اہلِ قلم اور شعرائے کرام فیض آباد میں جمع ہونے لگے۔ نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء۔۱۷۹۷ء) نے اپنا مسکن لکھنؤ بنایا۔ اور جو شہرت پہلے فیض آباد کو حاصل تھی اب لکھنؤ کے حصے میں آئی۔ ۱۷۹۷ء کو آصف الدولہ کے بعد وزیر علی خاں نے اودھ کا انتظام سنبھالا مگر چار ماہ حکومت کر سکے۔ ان کے بعد سعادت علی خاں ۱۷۹۷ء۔ ۱۸۱۴ء تک سترہ سال حکومت کرتے رہے ان کے دور میں انگریز ریزیڈنٹ نصف صوبے پر حکمران ہو چکا تھا۔ ان کے بعد غازی الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ جنھیں انگریزوں نے ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۰ء کو بادشاہ کالقب دے کر اودھ کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

لکھنؤ میں ۱۸۲۸ء میں غازی الدین کی جگہ نصیر الدین حیدر بادشاہ بنے اور دس سال حکومت کرنے کے بعد وفات پاگئے۔ جن کے بعد ۱۸۳۷ء میں محمد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ ۷ مئی ۱۸۴۳ میں محمد علی شاہ کا انتقال ہوا۔ تو امجد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ امجد علی شاہ پانچ سال حکومت کر کے ۱۸۴۷ء میں فوت ہوئے اور واجد علی شاہ تخت پر بیٹھے لیکن ۹ سال کی مختصر مدت میں سلطنت اودھ ۱۸۵۶ء میں ضبط کر لی گئی۔ بادشاہ کو مٹیا برج کلکتہ بھیج دیا دیا گیا اور مشرقی تمدن کا آخری نمونہ برطانوی سامراج کے زیرِ نگین آ گیا۔

شعر وادب پر اثرات:

عیش ونشاط، امن وامان اور شان وشوکت کے اس ماحول میں فنون نے بہت ترقی کی۔ راگ رنگ اور رقص وسرور کے علاوہ شعر وشاعری کو بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ دہلی کی بدامنی اور انتشار پر اہل علم وفن اودھ اور خاص کر لکھنو میں اکھٹا ہونا شروع ہوگئے۔ یوں شاعری کا مرکز دہلی کے بجائے لکھنو میں قائم ہوا۔ دربار کی سرپرستی نے شاعری کا ایک عام ماحول پیدا کر دیا۔ جس کی وجہ سے شعر وشاعری کا چرچا اتنا پھیلا کہ جابجا مشاعرے ہونے لگے۔ امراء روساء اور عوام سب مشاعروں کے دیوانے تھے۔ ابتداء میں شعرائے دہلی کے اثر کی وجہ سے زبان کا اثر نمایاں رہا لیکن، آہستہ آہستہ اس میں کمی آنے لگی۔ مصحفی اور انشاء کے عہد تک تو دہلی کی داخلیت اور جذبات نگاری اور لکھنو کی خارجیت اور رعایت لفظی ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ لکھنو کی اپنی خاص زبان اور لب ولہجہ بھی نمایاں ہوتا گیا۔ اور یوں ایک نئے دبستان کی بنیاد پڑی جس نے اردو ادب کی تاریخ میں دبستان لکھنو کے نام سے ایک مستقل باب کی حیثیت اختیار کر لی۔

نمائندہ شعراء:

شیخ غلام علی ہمدانی مصحفی:(۱۷۵۱ء۔۔۔۱۸۲۵ء)

مصحفی دہلی سے ہجرت کر کے لکھنو آئے۔ ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شعری مزاج دہلی میں صورت پذیر ہوا لیکن لکھنو کے ماحول، درباداری کے تقاضوں اور سب سے بڑھ کر انشائؔ سے مقابلوں نے انہیں لکھنوی طرز اپنانے پر مجبور کیا۔ ان کا منتخب کلام کسی بھی بڑے شاعر سے کم نہیں۔ اگر جذبات کی ترجمانی میں میر تک پہنچ جاتے ہیں تو جرات اور انشائؔ کے مخصوص میدان میں بھی پیچھے نہیں رہتے۔ یوں دہلویت اور لکھنویت کے امتزاج نے شاعری میں شیرینی، نمکینی پیدا کر دی ہے۔ ایک طرف جنسیت کا صحت مندانہ شعور ہے تو دوسری طرف تصوف اور اخلاقی مضامین بھی مل جاتے ہیں۔

جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے — ہم نے بھی اپنے جی میں کیا کیا خیال باندھے

وہ جو ملتا نہیں ہم اس کی گلی میں دل کو — در و دیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں

تیرے کوچے میں اس بہانے ہمیں دن سے رات کرنا — کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

سید انشاء اللہ خان انشاء:(۱۷۵۶ء۔۔۔۱۸۱۷ء)

انشاء کے والدین دہلی سے مرشد آباد گئے جہاں انشاء کی ولادت ہوئی۔ انشاء کی ذہانت اور جدت پسندی انہیں اپنے ہم عصروں میں منفرد نہیں کرتی بلکہ تاریخ ادب میں بھی ممتاز مقام دلاتی ہے۔ غزل، ریختی، قصیدہ، اردو میں بے نقط دیوان "رانی کیتکی کی کہانی" جس میں عربی، فارسی کا ایک لفظ نہ آنے دیا۔ یہی نہیں انشاء پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے "دریائے لطافت" کے نام سے زبان و بیان کے قواعد پر روشنی ڈالی۔ انشاء نے غزل میں الفاظ کے متنوع استعمال سے تازگی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ تاہم بعض اوقات محض قافیہ پیمائی اور ابتذال کا احساس ہوتا ہے۔ انشاء کی غزل کا عاشق لکھنوی تمدن کا نمائندہ وہ بانکا ہے جس نے بعد ازاں روایتی حیثیت اختیار کر لی۔ انہوں نے غزل میں مزاح کی ایک نئی بنیاد ڈالی۔ زبان میں دہلی کی گھلاوٹ بر قرار رکھنے کی کوشش کی۔

گر ناز نیں کہے کا برا مانتے ہیں آپ — میری طرف دیکھئے میں ناز نیں سہی

لے کے اوڑھوں بچھاؤں یا لپیٹوں کیا کروں — روکھی پھیکی سوکھی ساکھی مہربانی آپ کی

شیخ قلندر بخش جرات:(۱۷۴۹ء۔۔۔۱۸۱۰ء)

جرات دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری کا مخصوص رنگ معاملہ بندی ہے۔ جو دبستان دہلی کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ روایت ہے کہ شریف زادیوں سے آزادنہ میل ملاپ اور زنان خانوں میں بے جھجک جانے کے لیے خود کو اندھا مشہور کر دیا۔ بہر حال نابینا ہونے کے شواہد ملتے ہیں۔ ان کے ہاں محبوب کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ جیتی جاگتی اور ایسی چلبلی عورت کی تصویر ہے جو جنسیت کے بوجھ سے جلد جھک جاتی ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جرات کی غزل کی عورت خود لکھنو ہی کی عورت ہے۔ زبان میں سادگی ہے اس لیے جنس کا بیان واضح اور دو ٹوک قسم کا ہے۔ شاید اسی لیے حسن عسکری انہیں مزے دار شاعر سمجھتے ہیں۔

کل وقت راز اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات — جرات کے جو گھر رات کو مہمان گئے ہم

کیا جانیے کم بخت نے کیا مجھ پہ کیا سحر — جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

حیدر علی آتش:(۱۷۷۸ء۔۔۔۱۸۴۶ء)

آتش فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ آتش نے نہایت سادہ زندگی بسر کی۔ طبیعت میں قناعت اور استغناہ کا مادہ تھا۔ انہوں نے کسی دربار سے تعلق پیدا نہ کیا اور نہ ہی کسی کی مدح میں کوئی قصیدہ کہا۔ آتش کی شاعری لکھنو میں پروان چڑھی مگر ایک دہلوی استاد مصحفی کے زیر سایہ، اس لیے دہلی اور لکھنو نے دبستانوں کی خصوصیت کا امتزاج پیدا ہو گیا۔ آتش ناسخ کے مدمقابل تھے۔ ناقدین نے ناسخ پر ان کو فوقیت دیتے ہوئے۔ لکھنو دبستان کا نمائندہ شاعر قرار دیا ہے۔ ان کے اکثر اشعار میں روانی موسیقیت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ محاورات ایسے بر محل استعمال ہوتے ہیں کہ شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے۔ آتش کا بھی نظریہ تھا۔

بندشِ الفاظ جڑنے میں نگوں سے کم نہیں　　شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش کے کلام کی اہم خصوصیات میں نشاطیہ انداز، صفائی اور محاورات کا بہترین استعمال ہے۔ کہیں کہیں ان کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے روایتی شاعری سے ہٹ کر کیفیت و مردانگی و خوداری کے جذبات کو قلم بند کیا۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا　　جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا　　شبہ ہو جاتا ہے پردے سے تیری آواز کا

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے　　ہزار ہا شجرِ سایہ دار رہ میں ہیں

شیخ امام بخش ناسخ: (۱۷۷۲ء۔۔۔۱۸۳۸ء)

ناسخ کی شاعری میں نہ تو جذبات و احساسات ہیں اور نہ ہی ان کی پیدا کردہ سادگی ملتی ہے۔ انہوں نے مشکل زمینوں، اَنمل قوافی اور طویل ردیفوں کے بل پر شاعری ہی نہ کی بلکہ استادی بھی تسلیم کرائی۔ آج ان کی اہمیت زبان کی صفائی پیدا کرنے اور متروکات کی باقاعدہ مہم چلانے کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے زبان و بیان کے قوانین کی خود پیروی ہی نہ کی بلکہ اپنے شاگردوں سے ان کی پابندی کرائی۔ یوں اردو غزل کی زبان کو جھاڑ جھنکار سے پاک صاف کرنے والوں میں انہیں مستقل اہمیت حاصل ہے۔ لیکن صرف الفاظ کی بازیگری شاعری نہیں ہوتی۔ ان کے ہاں جذبے کا فقدان ہے۔ مولوی عبدالحق ان کے کلام کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ناسخ بلاشبہ ایک اچھے اور پاکیزہ طرز کا ناسخ اور ایک بھونڈے طرز کے موجد ہیں۔ ان کے کلام میں نہ نمکینی ہے نہ شیرینی۔"

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں　　اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستان پیدا

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے کوئی　　دل ہی دل میں ہم اسے یاد کیا کرتے ہیں

خصوصیات:۔

اکثر و بیشتر نقادوں نے دبستان لکھنو کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دلی کے مقابلے میں لکھنو کی شاعری میں خارجیت کا عنصر نمایاں ہے۔ واردات قلبی اور جذبات و احساسات کی ترجمانی اور بیان کے بجائے شعرائے لکھنو کا زیادہ زور محبوب کے لوازم ظاہری اور متعلقات خارجی کے بیان پر ہے۔ دوسری بات یہ کہ لکھنوی شاعری کا دوسرا اہم عنصر نسائیت ہے۔ اس کے علاوہ معاملہ بندی، رعائیت لفظی، صنعت گری اور تکلفات پر زیادہ زور ہے ذیل میں ہم اس کا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

خارجیت اور بیروں بینی:

دلی کی شاعری کے مقابلے میں لکھنو کی شاعری فکر اور فلسفے سے بالکل خالی ہے۔ نتیجتاً اس میں گہرائی مفقود ہے۔ اور ظاہر داری پر زور ہے۔ دروں بینی موجود نہیں۔ سوز و گداز کی شدید کمی ہے۔ خارجیت اور بیروں بینی کے مختلف مظاہر البتہ نمایاں ہیں لکھنو کی شاعری میں واردات قلبی کے بجائے سراپا نگاری پر زور ہے۔ ان کی شعری خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے سید وقار عظیم لکھتے ہیں،

"لکھنویت تکلف اور تصنع کا دوسرا نام ہے۔ جہاں شاعر محسوسات اور واردات کی سچی دنیا کو چھوڑ کر خیال کی بنی ہوئی رنگین فکر کی پیدا کی ہوئی پر پیچ راہوں پر چل کر خوش ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے۔ کہ لکھنو کی ساری زندگی میں ظاہر پر اس قدر زور تھا کہ شعراء کو دروں بینی کی مہلت ہی نہیں ملی۔ ان کی نظروں کے سامنے اتنے مناظر تھے کہ ان کے دیکھنے سے انہیں فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ ایسے میں دل کی کھڑی کھول کر میر کی طرح اپنی ذات کے اندر کون جھانکتا۔ جب انھوں عیش و عشرت اور آرائش وزیبائش کی محفلوں سے فرصت نہیں تھی

دیکھی شب وصل ناف اُس کی — روشن ہوئی چشم آرزو کی

کتنا شفاف ہے تمہارا پیٹ — صاف آئینہ سا ہے سارا پیٹ

بوسہ لیتی ہے تیرے پالے کی مچھلی اے صنم — ہے ہمارے دل میں عالم ماہی بے آب کا

روشن یہ ہے کہ سبز کنول میں ہے سبز شمع — دھانی لباس پہنے جو وہ سبز رنگ ہے

مضمون آفرینی:

دبستان لکھنو کی شاعری کی دوسری نمایاں خصوصیت مضمون آفرینی ہے۔ مضمون آفرینی کا مطلب یہ ہے کہ شاعر روایتی مضامین میں سے نئے مبالغہ آمیز اور عجیب وغریب پہلو تلاش کرلیتا ہے۔ ایسے مضامین کی بنیاد جذبے کے بجائے تخیل یاواہمے پر ہوتی ہے۔ شعراء لکھنو نے اس میدان میں بھی اپنی مہارت اور کمال دکھانے کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ اس کی چند مثالیں مندرجہ زیل ہیں۔

گلبرگ تر سمجھ کے لگا بیٹھی ایک چونچ — بلبل ہمارے زخم جگر کے کھرنڈ پر

چشم بدور آج آتے ہیں نظر کیا گال صاف — سبزہ خط کیا غزال چشم کا چارہ ہوا

اس نے پونچھا پسینہ روئے عالمتاب کا — بن گیا رومال کو نہ چادر مہتاب کا

معاملہ بندی:

سراپا نگاری اور مضمون آفرینی کے علاوہ دبستان لکھنو کی شاعری کی ایک اور خصوصیت جس کی نشان دہی نقادوں نے کی ہے وہ معاملہ بندی ہے۔ چونکہ دلی کی تباہی کے وقت لکھنو پر امن تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ لوگ خوشحال اور فارغ البال تھے۔ بادشاہ وقت امراء، وزراء اور عوام الناس تک سب عیش و عشرت میں مبتلا تھے۔ خصوصاً طوائف کو اس ماحول میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ ماحول کے اثرات شاعری پر بھی پڑے جس کی وجہ سے بقول ڈاکٹر ابو للیث صدیقی جذبات کی پاکیزگی اور بیان کی متانت جو دہلوی شاعری کا امتیازی نشان تھی یہاں عنقا ہو گئی۔ اس کی جگہ ایک نئے فن نے لے لی جس کا نام معاملہ بندی ہے۔ جس میں عاشق اور معشوق کے درمیان پیش آنے والے واقعات پر دہ دروں، کو کھول کر بیان کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ایسے اشعار خال خال دہلوی شعراء کے ہاں بھی موجود ہیں اور یہ بات بھی درست ہے کہ اس فن میں جرات پیش پیش تھے جو دلی سے آئے تھے۔ لیکن لکھنو کا ماحول ان کو بہت راس آیا۔ چنانچہ ان کے ساتھ لکھنو کے دیگر شعراء نے جی بھر کر اپنے پست جذبات کو نظم کیا۔ ان کی گل افشانی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں،

کھولیے شوق سے بند انگیا کے
لیٹ کر ساتھ نہ شرمایئے آپ

کل وقت راز اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات
جرات کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم

کیا جانیے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت

منہ گال پہ رکھنے سے خفا ہوتے ہو ناحق
مس کرنے سے قراں کی فضیلت نہیں جاتی

تلخ بادام کا منہ میں میرے آتا ہے مزہ
چشم کا بوسہ جو وہ ہو کے خفا دیتا ہے

رعایت لفظی:

دبستان لکھنو کی ایک اور خصوصیت رعایت لفظی بتائی جاتی ہے اس پہلو کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا لکھتے ہیں۔

"لکھنو کا معاشرہ خوش مزاج، مجلس آراء اور فارغ البال لوگوں کا معاشرہ تھا۔ مجلس زندگی کی جان لفظی رعایتیں ہوتی ہیں۔ مجلوں میں مقبول وہی لوگ ہوتے ہیں جنہیں زبان پر پوری قدرت ہو اور لفظ کا لفظ سے تعلق، اور لفظ کا معنی سے رشتہ پوری طرح سمجھتے ہوں۔ لفظی رعایتیں محفل میں تفریح کا ذریعہ ہوتی ہیں، اور طنز کو گوارا بناتی ہیں۔

لکھنو میں لفظی رعایتوں کا ازحد شوق تھا۔ خواص و عوام دونوں اس کے بہت شائق تھے۔ روساء اور امراء تک بندیاں کرنے والوں کو باقاعدہ ملازم رکھا کرتے تھے۔ ان ہی اسباب کی بناء پر لکھنوی شاعری میں رعایت لفظی کی بہتات ہے اور لفظی رعایتیں اکثر مفہوم پر غالب آجاتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات محض لفظی رعایت کو منظوم کرنے کے لئے شعر کہا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر

ہندو پسر کے عشق کا کشتہ ہوں باغباں
لالہ کا پھول رکھنا امانت کی گور پر

غسل کر لے یہیں دریا میں نہانے کو نہ جا
مچھلیاں لپٹیں گی اے یار تیرے بازو سے

وصل کی شب پلنگ کے اوپر
مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

طویل غزلیں:

لکھنوی شاعری کی ایک اور نمایاں بات طویل غزلیں ہیں۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ ابتداء جرات مصحفی نے کی جو دلی دبستان سے تعلق رکھتے تھے۔ جو دلی کی تباہی کے بعد لکھنو جا بسے تھے۔ لیکن لکھنوی شعراء نے اس کو زیادہ پھیلایا اور بڑھایا اور اکثر لکھنوی شعراء کے ہاں طویل غزلیں بلکہ دوغزلہ، اور سہ غزلہ کے نمونے ملتے ہیں۔ اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ لکھنو کے اس دور میں پر گوئی اور بدیہہ گوئی کو فن قرار دے دیا گیا تھا۔ نیز لوگ قافیہ پیمائی کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے طویل غزلیں بھی لکھی جانے لگیں چنانچہ ۲۵۔۱۳۰ اشعار پر مشتمل غزلیں تو اکثر ملتی ہیں۔ بلکہ بقول ڈاکٹر خواجہ ذکریا بعض اوقات اس سے بھی زیادہ طویل غزلیں بھی لکھی جاتی تھیں۔

قافیہ پیمائی:

طویل غزل سے غزل کو فائدے کے بجائے یہ نقصان ہوا کہ بھرتی کے اشعار غزل میں کثرت سے شامل ہونے لگے۔ شعراء نے زور کلام دکھانے کے لئے لمبی ردیفیں اختیار کرنی شروع کر دیں جس سے اردو غزل میں غیر مستعمل قافیوں اور بے میل ردیفوں کا رواج شروع ہوا۔ معمولی قافیوں اور ردیفوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس نے قافیہ پیمائی کا رواج شروع ہوا۔ ذیل میں بے میل ردیفوں سے قافیوں کی چند مثالیں درج ہیں۔

انتہائی لاغری سے جب نظر آیا نہ میں — ہنس کر کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے

فوج لڑکوں کی جڑے کے وں نہ تڑاتڑ پتھر — ایسے خبطی کو جو کھائے ہے کڑا کڑ پتھر

لگی غلیل سے ابرو کی، دل کے داغ کو چوٹ — پر ایسے ہی کہ لگے تڑ سے جیسے زاغ کو چوٹ

بات طویل غزلوں اور، بے میل ردیفوں اور قافیوں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ شعراء لکھنو نے اپنی قادر الکلامی اور استادی کا ثبوت دینے کے لئے سنگلاخ زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی۔

پیچ دار تشبیہ اور استعارے کا استعمال:

اگرچہ تشبیہ اور استعارے کا استعمال ہر شاعر کرتا ہے لیکن یہ چیز اس وقت اچھی معلوم ہوتی ہے جب حد اعتدال کے اندر ہو۔ شعراء دلی کے ہاں بھی اس کا استعمال ہوا لیکن لکھنو والوں نے اپنی رنگین مزاجی کی بدولت تشبیہوں کا خوب استعمال کیا اور ان میں بہت اضافہ کیا۔ محسن کاکوروی، میر انیس، نسیم، دبیر، نے پر کیف، عالمانہ اور خوبصورت تشبیہیں برتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کئی شعراء صرف تشبیہ برائے تشبیہ بھی لے آئے ہیں جس سے کلام بے لطف اور بے مزہ ہو جاتا ہے۔

سبزہ ہے کنارے آب جو پر — یا خضر ہے مستعد وضو پر

محو تکبر فاختہ ہے — قد و قامت سرو دلربا ہے

کیاری ہر ایک اعتکاف میں ہے — اور آب رواں طواف میں ہے

ساقی کی مست آنکھ پہ دل ٹوٹ جاتے ہیں — شیشے جھکے ہوئے ہیں پیالوں کے سامنے

آگیا وہ شجر حسن نظر جب ہم کو — بوسے لے کے لب شریں کے چھورائے توڑے

نسائیت:

ڈاکٹر ابو للیث صدیقی نے لکھنوی دبستان کی شاعری کا ایک اہم عنصر نسائیت بتایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ہر زمانے ہر قصہ اور ہر زبان میں عورت شاعری کا بڑا اہم موضوع رہا ہے۔ لیکن لکھنو کی سوسائٹی میں عورت کو اہم مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اس نے ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اگر یہ عورتیں پاک دامن اور عفت ماب ہوتیں تو سوسائٹی اور ادب دنوں پر ان کا صحت مند اثر پڑتا لیکن یہ عورتیں بازاری تھیں۔ جو صرف نفس حیوانی کو مسسل کرتی تھیں۔ جبکہ دوسری طرف عیش و عشرت اور فراغت نے مردوں کو مردانہ خصائل سے محروم کرکے ان کے مردانہ جذبات و خیالات کو کمزور کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کے جذبات خیالات اور زبان پر نسائیت غالب آگئی۔ چنانچہ ریختہ کے جواب میں ریختی تصنیف ہوئی۔ اس کا سہرا عام طور پر سعادت یار خان رنگین کے سر باندھا جاتا ہے۔ رنگین کے بعد انشاء اور دوسرے شعراء نے بھی اسے پروان چڑھایا۔ ان شعراء کے

ہاں ریختی کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں عورتوں کے فاحشانہ جذبات کو ان کے خاص محاوروں میں جس طرح ان لوگوں نے نظم کیا ہے وہ لکھنو کی شاعری اور سوسائٹی کے دامن پر نہ مٹنے والا داغ بن کر رہ گیا ہے۔

سوز و گداز:

اس ساری بحث سے ہر گز یہ مقصود نہیں کہ لکھنوی شعراء کے ہاں اعلیٰ درجے کی ایسی شاعری موجود نہیں جو ان کے سوز و گداز جذبات اور احساسات اور واردات قلبیہ کی ترجمان ہو۔ تمام نقادوں نے اس بات کی تائید کی ہے بلکہ عذلیب شادانی جنہوں نے لکھنوی شاعری کے خراب پہلوئوں کو تفصیل کے ساتھ نمایاں کر کے پیش کیا ہے وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ شعرائے لکھنو کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو پڑھنے والے کے دل پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ ایسے نمونے ناسخ اور آتش کے علاوہ امانت اور رند وغیرہ کے ہاں سب سے زیادہ ملتے ہیں۔ یہاں اس بات کے ثبوت میں مختلف شعراء کا کلام سے کچھ مثالیں:

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی ۔۔۔ دل ہی دل میں اسے ہم یاد کیا کرتے ہیں

تاب سننے کی نہیں بہر خدا خاموش ہو ۔۔۔ ٹکڑے ہوتا ہے جگر ناسخ تیری فریاد سے

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے ۔۔۔ میں جاء ہی ڈھونڈتا تیری محفل میں رہ گیا

کسی نے مول نے پوچھا دل شکستہ کا ۔۔۔ کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

بتوں کے عشق میں کیا جی کو اضطراب دیا ۔۔۔ یہ دل دیا کہ خدا نے مجھے عذاب دیا

دل نے شب فرقت میں کیا ساتھ دیا میرا ۔۔۔ مونس اسے کہتے ہیں غم خوار اسے کہتے

آعندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں ۔۔۔ تو ہائے گل پکار میں چلائوں ہائے دل

ہم اسیروں کو قفس میں بھی ذرا چین نہیں ۔۔۔ روز دھڑکا ہے کہ اب کون رہا ہوتا ہے

حرم کو اس لئے اٹھ کر نہ بتکدے سے گئے ۔۔۔ خدا کہے گا کہ جور بتاں اٹھا نہ سکا

مجموعی جائزہ:۔

اردو ادب میں دونوں دبستانوں کی اپنے حوالے سے ایک خاص اہمیت ہے۔ دبستان لکھنو نے موضوعات کے بجائے زبان کے حوالے سے اردو ادب کی بہت خدمت کی اور ناسخ کی اصلاح زبان کی تحریک نے اردو زبان کو قواعد و ضوابط کے حوالے سے بہت زیادہ ترقی دی۔ جبکہ دبستانِ لکھنو کا اثر دہلی کے آخری دور کے شعراء غالب، مومن، ذوق پر بھی نمایاں ہے۔

امتحان مڈ ٹرم: بی ایس اردو   گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج بنوں   فرسٹ سمسٹر: اکتوبر: ۲۰۱۶

رول نمبر:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وقت: ۳۰۔ا   پرچہ: تاریخِ ادب اردو   کل نمبر: ۳۰

حصّہ اول، معروضی سوالات

(نوٹ) یہ حصّہ ۱۰ منٹ کے بعد لیا جائے گا۔   (۵)

سوال نمبر: (ا) دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

ا۔ "اردو قدیم ویدک بولی سے بنی ہے" یہ نظریہ کس نے پیش کیا؟

(ا) ڈاکٹر سہیل بخاری   (ب) ڈاکٹر شوکت حسین سبزواری   (ج) ڈاکٹر عین الحق فرید کوٹی

۲۔ اردو اور پشتو بناوٹ کے لحاظ سے زبانوں کے کس گروہ سے تعلق رکھتی ہیں؟ (ا) تجریدی   (ب) ترکیبی   (ج) تحلیلی

۳۔ "خیر البیان" کس کی تصنیف ہے؟   (ا) امیر خسرو   (ب) پیر روشان   (ج) حضرت بابا فرید گنج شکر

۴۔ اردو کا سب سے پرانا نام کیا ہے۔؟   (ا) ریختہ   (ب) اردوئے معلیٰ   (ج) ہندی / ہندوی

۵۔ "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" کس انگریز مستشرق کی کتاب ہے۔؟ (ا) فیلن (ب) گارساں دی تاسی   (ج) گریرسن

حصّہ دوم

مندرجہ ذیل سوالات میں سے کوئی سے تین سوال حل کریں۔   (۱۵)

سوال نمبر ۲۔ زبان کیا ہے نیز تاریخی اور نسلی اعتبار سے دنیا کی زبانوں کو کتنے گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے؟

سوال نمبر: ۳۔ اردو اور پشتو کے لسانی وحدت پر مختصر نوٹ لکھیں؟

سوال نمبر: ۴۔ اردو کی پیدائش کے قدیم نظریات پر بحث کریں؟

سوال نمبر: ۵۔۔ اردو کے مختلف علاقائی نام کون کون سے ہیں۔؟

حصّہ سوم

کسی ایک سوال کا مفصّل جواب تحریر کریں۔   (۱۰)

سوال نمبر: ۶۔ اردو زبان کی پیدائش اور ارتقاء کے بارے میں جو علاقائی نظریات پیش کی گئی ہیں ان میں سے کسی دو نظریات پر بحث کریں۔؟

یا

اردو زبان کے مختلف ادوار میں مختلف نام اور وجہِ تسمیہ پر مفصّل نوٹ لکھیں۔؟